MIRZA GHALIB MIRZA ASADULLAH BAIG KHAN

دیوانِ غالب

اردو کُتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot

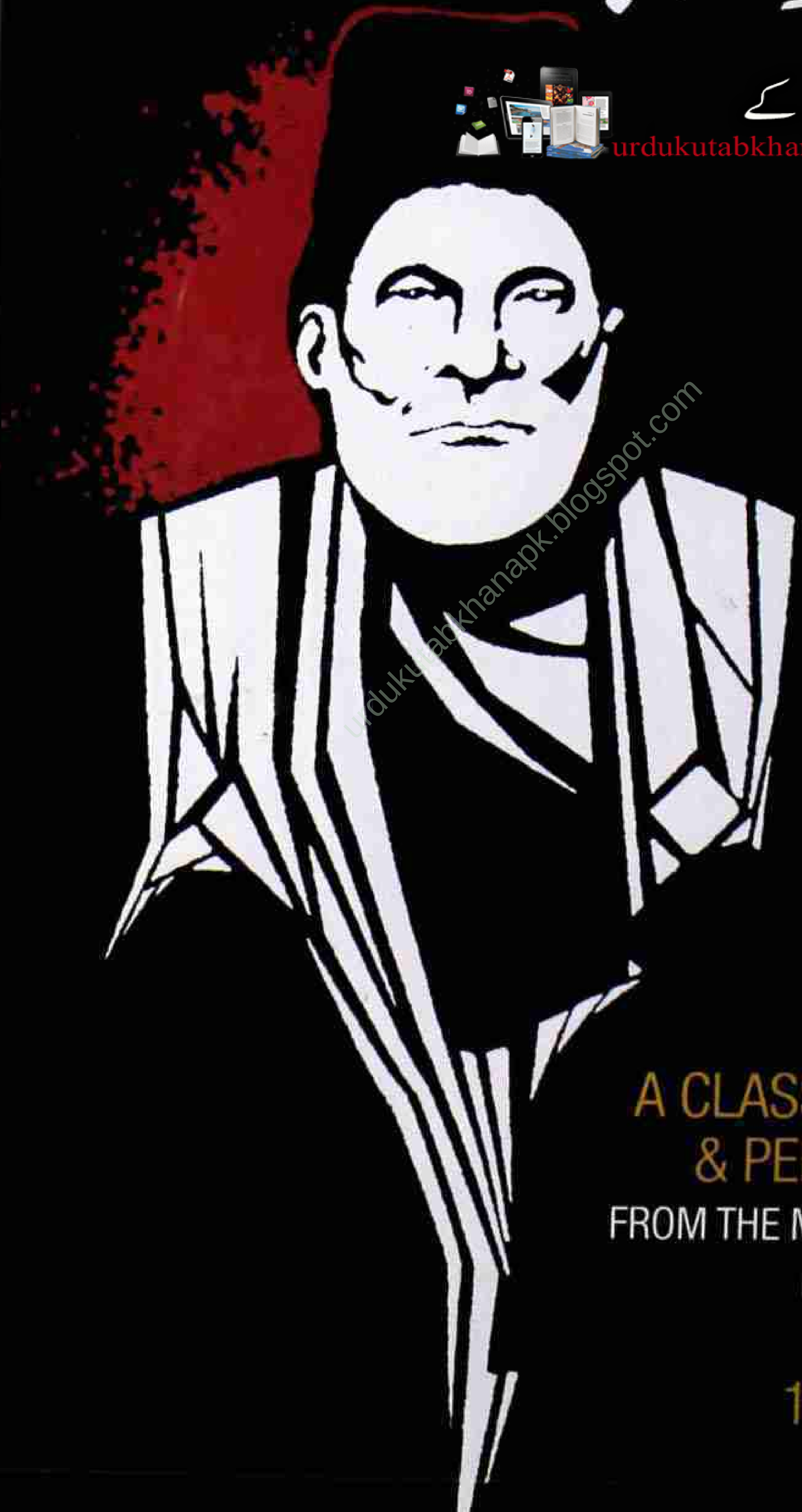

A CLASSICAL URDU
& PERSIAN POET
FROM THE MUGHAL EMPIRE
DURING BRITISH
COLONIAL RULE
1797 - 1869

اُردو کُتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot

دیوانِ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ناشر

ثناء پبلی کیشنز۔ کراچی

موبائل نمبر: 0300-9231954

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب .... دیوانِ غالب
شاعر .... مرزا اسد اللہ خاں غالب
بار اول .... جون 2009ء
تعداد .... گیارہ سو
کمپوزنگ .... نثار احمد بلوچ
مارکیٹنگ .... عمران میمن

قیمت -/300 روپے

اسٹاکسٹ

☆ رشید نیوز ایجنسی .... فریئر مارکیٹ۔ کراچی
☆ الرحمٰن بک پیلس .... اردو بازار۔ کراچی
☆ طاہر سنز .... اردو بازار۔ لاہور
☆ کتاب گھر .... کمیٹی چوک۔ راولپنڈی
☆ کتب خانہ مقبول عام .... جھنگ بازار۔ فیصل آباد
☆ فیصل بک اسٹال .... کھارادر۔ کراچی

○

بہ مہر نامہ جو بوسہ گُل پیام رہا   ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
ہوا نہ مجھ سے بجز درد، حاصلِ صیّاد   بسانِ اشک گرفتارِ چشم دام رہا
دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے   ولے ہنوز خیالِ وصالِ خام رہا
شکست رنگ کی لائی سحر، شبِ سُنبل   پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا!   کہ شب خیال میں بوسوں کا اِزدحام رہا
نہ پوچھ حال شب و روزِ ہجر کا، غالبؔ!
خیالِ زُلف و رُخِ دوست صبح و شام رہا

فہرست

مرزا اسد اللہ خاں غالب ....
نقش، فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا 21
جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار 22
کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا 23
دل مرا سوزِ نہاں سے بے مُحابا جل گیا 24
شوق، ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا 25
دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا 26
شمارِ سُبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا 27
دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا 28
ستائشگر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا 29
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا 32
بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کُھلا 33
شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا 35
نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا 36
ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب 37
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا 38
شب خُمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا 40
دوست، غمخواری میں میری سعی فرماوینگے کیا 41
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا 42
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا! 44
درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا 45

پئے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا 47
گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا 48
درد منّت کشِ دوا نہ ہوا 50
گِلہ ہے، شوق کو، دل میں بھی تنگیِ جا کا 51
قطرۂ مے، بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا 52
یک ذرّۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا 53
وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا 54
پھر، مجھے دیدۂ تر یاد آیا 55
ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا! 56
تو دوست کسی کا بھی، ستمگر! نہ ہوا تھا 58
شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا 59
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا 60
رشک کہتا ہے کہ 'اُس کا غیر سے اخلاص حیف! 61
ذکر اُس پری وش کا' اور پھر بیاں اپنا 62
غافل، بہ وہمِ ناز، خود آرا ہے' ورنہ یاں 63
جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا! 64
عشرتِ قطرہ ہے' دریا میں فنا ہو جانا 65
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب 67
افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے 69
آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست 70
غیر یُوں کرتا ہے میری پُرسش، اُس کے ہجر میں 71
گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج 72
نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ 73
حُسن، غمزے کی کشاکش سے چھُٹا میرے بعد 74
بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار 75
گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر 77

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر 79
لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر 81
ہے بسکہ ہر اِک اُن کے اشارے میں نشاں اور 82
صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر 84
جنوں کی دستگیری کِس سے ہو، گر ہو نہ عُریانی 84
لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور 85
نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز 89
مژدہ اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے 91
رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع 93
زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک 94
آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہوتے تک 96
ہے کِس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل 97
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفَس 99
وہ فراق اور وہ وصال کہاں 101
کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں 101
آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں 103
عُہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا 105
مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے، چاہو جس وقت 106
ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن 107
ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گُماں نہیں 108
مانعِ دشت نوردی' کوئی تدبیر نہیں 110
جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں 112
مِلتی ہے خوئے یار سے نار اُلتہاب میں 113
کل کے لیئے، کر آج نہ خسّت شراب میں 115
حیراں ہوں' دل کو رووٴں کہ پیٹوں جگر کو میں 117
ذکر میرا، بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں 119

نالہ جز حسنِ طلب‘ اے ستم ایجاد! نہیں 121
یہ ہم‘ جو ہجر میں‘ دیوار و در کو دیکھتے ہیں 124
نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں 125
تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں 126
دائم پڑا ہُوا ترے در پر نہیں ہوں میں 127
سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں 128
دیوانگی سے، دوش پہ زُنّار بھی نہیں 131
نہیں ہے زخم کوئی، بخیے کے درخُور مرے تن میں 133
مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں 134
دل ہی تو ہے‘ نہ سنگ و خشت‘ درد سے بھر نہ آئے 135
غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ ”یوں“ 137
حسد سے‘ دل اگر افسردہ ہے‘ گرم تماشا ہو 139
وارستہ اِس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو 140
قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو 142
دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو 144
واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو 145
تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو 147
گئی وہ بات کہ‘ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو! 148
کسی کو دے کے دل‘ کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو! 150
مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے 154
بساطِ عجز میں تھا ایک دل‘ یک قطرہ خوں وہ بھی 155
ہے بزمِ بُتاں میں سخن آزردہ لبوں سے 156
غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی 157
کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے 159
درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری‘ ہائے ہائے! 160
سر گشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے 162

گر خامشی سے فائدہ اِخفائے حال ہے 163

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مِٹ گیا 164

مری ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے 165

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے 166

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی 167

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے 169

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے 170

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اِضطراب ہے 172

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے 173

سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے 176

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی 177

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے 179

کوئی دن، گر زندگانی اور ہے 180

کوئی اُمید بر نہیں آتی 181

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟ 182

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے 183

پھر کچھ اِک دل کو بیقراری ہے 185

جُنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی 186

نکوہش ہے سزا، فریادیِ بیدادِ دلبر کی 186

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے 187

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی 189

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے 189

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے 191

جس بزم میں تو ناز سے گُفتار میں آوے 193

حُسنِ مہ، گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے 195

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی 197

عجب نشاط سے' جلّاد کے چلے ہیں ہم' آگے 198
شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے 199
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کو ''تو کیا ہے''؟ 201
میں اُنہیں چھیڑوں، اور کچھ نہ کہیں 203
غیر لیں محفل میں، بوسے جام کے 204
پھر اس انداز سے بہار آئی 205
کب وہ سُنتا ہے کہانی میری 206
جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی 208
سیماب، پُشت گرمیِ آئینہ دے ہے' ہم 209
چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے 210
ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے 212
نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے 214
چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عُریانی کرے 216
وہ آ کے، خواب میں' تسکینِ اضطراب تو دے 217
تپش سے میری، وقفِ کش مکش' ہر تارِ بستر ہے 218
ہم رشک کو اپنے بھی' گوارا نہیں کرتے 220
کرے ہے بادہ' ترے لب سے' کسبِ رنگِ فروغ 220
کیوں نہ ہو چشمِ بُتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟ 221
دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے' کیا کہیے 221
دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے 223
یاد ہے شادی میں بھی' ہنگامۂ یارب' مجھے 224
حضورِ شاہ میں' اہلِ سخن کی آزمائش ہے 255
کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں' گر آ جائے ہے' مجھ 227
زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے 228
لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا' دے مجھے 229
بازیچۂ اطفال ہے' دنیا' مرے آگے 230

کہوں جو حال، تو کہتے ہو، "مدّعا کہیے" 232
رونے سے، اور عشق میں بیباک ہو گئے 234
عرضِ نازِ خموشی دنداں، برائے خندہ ہے 236
جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی 237
ابنِ مریم ہوا کرے کوئی 239
بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے! 240
باغ، پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے 241
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے 243
ہجومِ نالہ، حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے 246
خموشیوں میں، تماشا ادا نکلتی ہے 247
جس جا نسیم شانہ کش زلفِ یار ہے 247
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے 249
شبنم بہ گلِ لالہ، نہ خالی ز ادا ہے 250
منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نور کی 252
غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے 254
مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے 255
نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست جاں کے لئے 258
منقبت میں 260
مطلعِ ثانی 262
منقبت میں 263
ہاں، مہِ نو! سُنیں ہم اُس کا نام 267
زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام 268
قصیدہ 270
کُنج میں بیٹھا رہوں یُوں پر کھلا 271
مثنوی در صفتِ انبہ 273
قطعات 275

در مدحِ ڈلی 278

بیانِ مصنف 280

مدح 282

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صَفر، چلو 283

در مدحِ شاہ 284

قطعہ 286

گزارشِ مصنف بحضورِ شاہ 286

رباعیات 290

ضمیمہ 296

اپنا احوالِ دلِ زار، کہوں یا نہ کہوں! 298

ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں 299

مجلسِ شمع عذاراں میں جو آ جاتا ہوں 300

شبِ وصال میں، مُونس گیا ہے بَن تکیہ 301

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی 302

کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے 303

آپ نے مَسَّنِیَ الضُّرُّ، کہا ہے تو سہی 304

لطفِ نظارۂ قاتل، دمِ بسمل آئے 305

بہادر شاہ ظفر 307

قصیدہ 311

مثنوی 320

قطعات 321

قطعۂ تاریخِ اختتامِ کتاب 324

فردیات 332

نسخۂ حمیدیہ 335

☆

☆ ☆ ☆

اُردو کُتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ولادت آگرہ: ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷

وفات دہلی: ۱۵ر فروری ۱۸۶۹

مختصر حالاتِ زندگی:

نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطابات، اسد اللہ خان نام مرزا نوشہ عرف اور غالب تخلص تھا والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ جو سپاہی پیشہ تھے وہ ریاست اودھ، ریاست حیدرآباد اور ریاست الور سے وابستہ رہے مرزا غالب نے ابھی پانچویں برس میں قدم رکھا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اب ان کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ کے ذمہ ہوئی جو مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد میں صوبیدار تھے اور سترہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے، ڈیڑھ لاکھ روپے کی جاگیر بھی تاحیات عطا ہوئی تھی' انہوں نے اس دُرِ یتیم کو اپنی آغوشِ محبت میں لے کر گوہرِ محبت والفت نثار کیے۔ نو برس کی عمر میں شفیق چچا بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ تنخواہ بند اور جاگیر ضبط ہو گئی۔ مرزا ننھیال میں آ گئے یہاں ان کے نانا خواجہ غلام حسین نے انہیں ہر طرح کی آسائش بہم پہنچائی۔ یہ زمانہ غالب کی بے فکری اور فراغت کا زمانہ تھا۔ تعلیم و تربیت کے لئے مولوی معظم علی، نظیر اکبرآبادی، اور ملا عبدالصمد پارسی جیسے اساتذہ موجود تھے۔ ۱۳ برس کی عمر میں ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی اُمراؤ بیگم

بسے ہوئی۔ شادی کے بعد دلّی چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ اگرچہ اس ذوق کی تکمیل دلی میں ہوئی۔

غالب مالی طور پر ہمیشہ تنگ دست رہے اگرچہ تنگ دستی میں ان کی شاہ خرچی کو بھی بڑا دخل ہے۔ چچا کی پنشن میں سے انہیں بھی حصہ ملا کرتا تھا۔ جو بعض وجوہات کی بنا پر بند ہوگیا۔ اس کی بحالی کے لئے مرزا نے بہت جتن کیے۔ کلکتہ میں مقدمہ کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ واپس آتے ہوئے لکھنؤ اور بنارس کی سیر کی نواب نصیر الدین حیدر والی ریاست اودھ کا قصیدہ لکھا۔ پانچ صد روپے سے سالانہ وظیفہ مقرر ہوا مگر دو سال بعد ریاست کے خاتمہ کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مغلیہ دربار سے وابستگی، حتیٰ کہ ذوق کی وفات کے بعد ''استادِ شہ'' ہو جانے پر بھی انہیں آسودگی حاصل نہ ہوئی۔ نواب رامپور یوسف علی خاں کی طرف سے سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ کچھ دوست احباب اور شاگرد خبر گیری کرتے تھے افسوس وہ امیر زادہ جو شاہانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوا۔ جس کی نوعمری کا زمانہ نہایت رئیسانہ، ٹھاٹھ باٹھ سے گذرا، اس کو صرف ملکِ سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے ساری عمر غریبانہ حال سے بسر کرنا پڑی۔ وہ ''گردشِ مدام'' سے گھبرائے ضرور کہ تقاضائے بشریت ہے۔ مگر انہوں نے گردشِ مدام کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے ان کی طبعی خوش طبعی ان کے آڑے آئی انہوں نے بڑے سے بڑے صدمے کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔ اور بالآخر اپنے خالق سے جا ملے۔

تصانیف:

(۱) دیوانِ اردو (۲) کُلیاتِ نظم فارسی (۳) کلیاتِ نثر فارسی (۴) عُودِ ہندی (اردو خطوط) (۵) اردوئے مُعلّٰی (اردو خطوط) (۶) لطائفِ غیبی (علمی مباحثے) (۷) قاطعِ بُرہان (مشہور فارسی لغت ''برہان قاطع'' پر اعتراضات (۸) تیغِ تیز (۹) غالب نامہ (دونوں کتابیں قاطع برہان کے ضمن میں ہیں) (۱۰) پنج آہنگ (فارسی انشاء پردازی اور خطوط)، (۱۱) مہرِ نیمروز (تاریخِ مغلیہ۔ امیر تیمور سے ہمایوں تک) (۱۲) دستنبو (جنگ آزادی ۱۹۵۷ کے

حالات) (۱۳) سبد چین (فارسی قصائد، قطعات اور خطوط)

غالب کی شاعرانہ عظمت:

غالب دنیائے شاعری کے ان چند درخشندہ ستاروں میں سے ہیں جن کی آب و تاب سے جہانِ شعر منور ہے۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کا انحصار ان کی جدت پسندی اور منفرد لب ولہجہ پر ہے انکے ہاں پیرایہ بیان میں دلفریبی کے علاوہ موضوعات کا بے حد تنوع اور رنگارنگی نظر آتی ہے اسی بنا پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کہتے ہیں۔ ”لوح سے تحت تک بمشکل سو صفحات ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں' کون سا نغمہ ہے جو اس کی زندگی کے تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں۔“ قدرت نے غالب کو وسیع مشاہدہ اور عمیق قوت متخیلہ سے نوازا تھا اسی لئے وہ شاعری کی سابقہ روایات سے یکسر روگردانی کر کے زبان و بیان اور معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک ایسا معیار مقرر کرتے ہیں جو اپنے اندر وسعت بھی رکھتا ہے اور جدت بھی۔ غالب تجربات و واقعات زندگی کو انوکھے اور منفرد زاویے سے دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنی جولانی طبع ندرتِ فکر و خیال اور جدّت ادا کی بدولت اردو شاعری کے قاری کو ایک نئے انداز میں سوچنا اور محسوس کرنا سکھایا اور بقول ڈاکٹر عبدالسلام ”ایک نیا ذہن' نیا شعور' نیا ماحول اور نیا نسب عطا کیا۔“ اسی بنا پر ایک نئے لب ولہجہ کی وجہ سے غالب اپنے روایت پسند دور میں نامقبول ہوا۔ لیکن بعد میں آنے والے دور میں جب فہم و ادراک کا محور وسیع ہوا تو غالب کی شاعری کو صحیح طور پر سمجھا جانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جو انسانی جذبہ واحساس کو متاثر کرنے کے علاوہ تفکر اور ذہن (Intellect) کو بھی اپیل کرتا ہے اعتبار سے اردو کا کوئی شاعر غالب کی ہمسری نہیں کرتا۔

غالب کی شاعری کا نقادوں نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور مشکل پسندی کا ہے۔ جس میں فارسی کے مشکل گو شاعر مرزا عبدالقادر بیدلؔ کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس دور میں غالب مشکل الفاظ اور تراکیب اور دور از کار تشبیہات و استعارات لاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسدؔ اللہ خان قیامت ہے

جلد ہی وہ فارسیت اور نازک خیالی کو خیر باد کہہ کر سادہ گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ دوسرے دور میں زبان و بیان قدرے صاف ہے۔

تیسرا دور غالب کے کمالِ فن کی آخری منزل ہے جس میں سادگی و پرکاری کا سارا لطف موجود ہے۔

خصوصیاتِ کلام

جدّت پسندی:

کلام غالب کی بنیادی خصوصیات جدت پسندی ہے ان کے ہاں جدت ادا، جدت مضامین، جدت تشبیہات و استعارات اور جدت خیال، غرض ہر پہلو سے انوکھا اور نرالا انداز ملتا ہے۔

بقول مولانا حالیؔ: ”جس روش پر دوسرے چل رہے تھے، مرزا نے اس سے الگ ایک نئی روش تلاش کی“

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

جدت ادا:

غالب کی شاعری میں جہاں نئے نئے موضوعات اور مضامین بیان ہوئے ہیں وہاں ان کا طرزِ ادا بھی منفرد ہے وہ معمولی سے معمولی بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ وہ بہت

ہی دلچسپ اور دل نشین بن جاتی ہے۔ طرزِ ادا کی اس خوبی کا خود غالب کو بھی احساس تھا وہ کہتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیان اور

غالب دوسرے شعراء کے بیان کردہ خیالات اور پامال مضامین کو اس حسن و خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ وہ بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں حقیقت میں طرفگی ادا کی صفت غالب کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ بقول آلِ احمد سرور۔

غالب کی شاعرانہ عظمت کا قصر ان کی جدت طرازی پر تعمیر ہوا ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تیری وفا سے ہو تلافی کہ دہر میں
ترے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ایجاز و اختصار:

غزل میں بات کو ڈھکا چھپا کر کہنا اس کی بنیادی خصوصیت ہے چنانچہ کلام غالب کی ایک ممتاز صفت ایجاز و اختصار ہے وہ کم سے کم الفاظ میں بڑے بڑے مفاہیم کو یوں ادا کرتے ہیں کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے ان کے اشعار کا ایک ایک لفظ ”گنجینۂ معنی کا طلسم“ ہے وہ شعر میں ایسے الفاظ و تراکیب استعمال کرتے ہیں جن سے تہ در تہ معنی کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

مضمون آفرینی:

غالب کے نزدیک شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ مضمون آفرینی ہے۔ وہ اشعار میں عجیب وغریب اور خیال افروز نکتے اور باریکیاں بیان کرتے جاتے ہیں غالب کا باریک بین ذہن معمولی بات کے ایسے پہلو پر جا پہنچتا ہے جس تک دوسروں کی رسائی تقریباً ناممکن ہے۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شوخی اور ظرافت:

غالب ایک شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ اور بقول حالی نکتہ داں، نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے۔ ان کی ذاتی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں کا شکار تھی پھر ان کا دور بھی مصائب اور ابتلاء کا دور تھا۔ لیکن غالب مزاج کے اعتبار سے انسانوں کی اس صف میں تھے جو غم میں مسکراتے ہیں۔ چنانچہ داخلی اور خارجی اعتبار سے مایوسی کے باوجود غالب کو جس چیز نے زندہ رکھا وہ ان کے مزاج کی زندہ دلی اور ہمہ گیری ہے۔ یہی زندہ دلی ان کی زندگی کی طرح شاعری اور خطوط میں بھی نہایت شگفتہ اور تروتازہ پھول کھلاتی ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پہلوداری:

غالب کی شاعری ایک اور نمایاں خوبی پہلوداری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اشعار میں اکثر اوقات دو دو مفاہیم پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو بظاہر ایک معنی ادا کرتے ہیں لیکن ذرا غور کرنے پر ایک اور معنی ذہن میں آتے ہیں جو نہایت پر لطف کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ”غالب کے اشعار ایک تراشے ہوئے نگینے کی مانند ہیں جو ہر پہلو سے ایک نیا انداز دکھاتا ہے“

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا
دائم پڑا ہوا تیرے دَر پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں میں
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مقرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

فلسفہ وحکمت:

غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے ہاں فلسفیانہ رموز اور حکیمانہ افکار بیان ہوئے ہیں ان سے قبل تصوف کے موضوعات عام تھے لیکن فلسفہ اور حکمت کے موضوعات ناپید تھے اگر چہ غالب باقاعدہ فلسفی نہیں تھے لیکن اپنے اشعار میں انہوں نے بعض اوقات ایسے ایسے رموز بیان کیے کہ وہ فلسفہ کی ضخیم کتابوں پر بھی بھاری ہیں غالب کا طرزِ استدلال فلسفیانہ ہے وہ حقائق کو فلسفیانہ نظر سے جانچنے کے عادی تھے جس سے بات میں وزن پیدا ہوتا ہے۔

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

انسانی نفسیات کی عکاسی:

غالب انسانی فطرت اور نفسیات کے گہرے رمز آشنا تھے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھتے تھے انہوں نے انسانی مزاج کی بوقلمونیوں کو زبانِ شعر میں بڑے دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں انسانی نفسیات، انسانی مزاج اور انسانی مسائل و حقائق کی گہری آگاہی نظر آتی ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا
کہ ہوگا باعث افزائش سوزِ دروں وہ بھی
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

روایت شکنی:

غالب طبعاً ایک جدت طراز اور روایت شکن انسان تھے ان کی زندگی، شاعری، اور خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ہر معاملے میں اپنی منفرد رائے رکھتے تھے۔ غالب کے مزاج میں خود پسندی حد درجہ تھی ان کے نظریات و تصورات اور سوچنے کے انداز میں بھی انفرادیت پائی جاتی ہے چنانچہ وہ بعض اوقات مروجہ عقائد و نظریات سے روگردانی کرتے ہیں اور روایتی خیالات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ایسے تصورات جنہیں تقدس کا درجہ حاصل ہے ان پر طنز اور چوٹ کرتے ہیں۔ وہ بعض اوقات اپنی ذات کو بھی نہیں بخشتے اور خدا تک سے بھی شوخی کر جاتے ہیں۔ محبوب، شیخ، زاہد، جنت و دوزخ، خضر، واعظ، حوریں، غرض کوئی بھی ان کے

نشترِ تنقید سے نہیں بچ سکا یہ سب ان کے مزاج کی جدت طرازی اور انفرادیت پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کیا کیا خضر نے سکندر سے!
اب کسے رہنما کرے کوئی!

ایسی جنات کا کیا کرے کوئی!
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

والسلام: ادارہ

☆......☆......☆

○

نقش، فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جُوئے شِیر کا

جذبۂ بے اِختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دَم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مُدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالبؔ! اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
مُوئے آتش دیدہ، ہے حلقہ مری زنجیر کا

○

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مُبارک باد، اسدؔ! غمخوارِ جان، درد مند آیا

○

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کُھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

ابھی تک

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ "رفت" گیا اور "بود" تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ!
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

○

کہتے ہو، نہ دینگے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گُم کیجے، ہم نے مُدّعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں، جرأت آزما پایا

غُنچہ پھر لگا کِھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا؟

○

دل مرا سوزِ نہاں سے بے مُحابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا، جل گیا

میں عدم سے بھی پَرے ہوں، ورنہ غافل! بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا۔ وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اِس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

◆

شوق، ہر رنگ رقیبِ سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب!
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

بُوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نو آموزِ فنا، ہمّتِ دُشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اِک شور اُٹھایا غالبؔ!
آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

○

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نَبرد تھا
عشقِ نَبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ، زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل، آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی، خیالِ بیاباں نَوَرد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے! عجب آزاد مرد تھا

◆

شمارِ سُبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشاے بہ یک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیض بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہواے سیرِ گل، آئینۂ بیمہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا

○

دہر میں، نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا، کاکلِ سرکش، نہ دبا
یہ زمرّد بھی، حریف دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی، راضی نہ ہوا

دل گزر گاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے، غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

○

ستائشگر ہے زاہد، اِس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے، بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر یک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع، میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خُرشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں، مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ، گویا حُجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا، خواب میں آ کر تبسّم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا، غالبؔ!
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

○

نہ ہو گا، یک بیاباں ماندگی سے، ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بید ماغی ہے
کہ موجِ بُوئے گُل سے، ناک میں آتا ہے دَم میرا

○

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں، اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے، ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

◆

محرم نہیں ہے تو ہی، نواہاے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہاے ناز کا

تو، اور سوے غیر نظر ہاے تیز تیز!
میں، اور دُکھ تری مژہ ہاے دراز کا!

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں، میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفَسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ، جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط، ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ!
سینہ، کہ تھا دفینہ گہر ہاے راز کا

○

بزمِ شاہنشاہ میں، اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو، یارب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اِس تکلّف سے کہ گویا بتکدے کا دَر کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اِک دَر ہے میری گور کے اندر کھلا

مُنہ نہ کُھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مِرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نُزول
آج اُدھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا؟

کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے، وطن سے، نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمّت میں ہوں مَیں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے، غالبؔ! گنبد بے در کھلا

○

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ، ہر یک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو، عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریے سے یاں، پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُرشور، بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز، محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفَس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اِس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذّت یاب تھا

○

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے!
خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی، کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرّہ ذرّہ روکشِ خُرشیدِ عالم تاب تھا

ق
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اِک دیدۂ بیخواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو، وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں، گردُوں کفِ سیلاب تھا

○

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں، اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ، تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اَب
دیکھا، تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

○

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی مُیسّر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

واے دیوانگیِ شوق، کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضاے نگہ کرتا ہے
جو آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتلگہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگِ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

کی، مرے قتل کے بعد، اُس نے جفا سے توبہ
ہائے، اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

حیف، اُس چار، گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ!
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

○

شب خُمارِ شوقِ ساقی رُستخیز اندازہ تھا
تامحیطِ بادہ، صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادۂ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حِنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالۂ یک دیوانِ بے شیرازہ تھا

○

دوست، غمخواری میں میری، سعی فرماوینگے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جاوینگے کیا

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور! کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماوینگے کیا؟

حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاوینگے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاوینگے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا، یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاوینگے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراوینگے کیا!

ہے اب اِس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت، اسدؔ!
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھاوینگے کیا؟

○

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پہ جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

آدھا کھنچا تیر
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست، ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ، پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گُسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان، غالبؔ!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

○

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا! نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا!
تجاہل پیشگی سے مدّعا کیا؟ کہاں تک اے سراپا ناز کیا، کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں شکایت ہائے رنگیں کا گِلا کیا!
نگاہِ بے مُحابا چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکیں آزما کیا!
فروغِ شعلۂ خس، یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا!
نفس، موجِ محیطِ بیخودی ہے تغافل ہائے ساقی کا گِلا کیا
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا
مُحابا کیا ہے، میں ضامن، اِدھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا!
سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا! سُن شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ، قاتل، وعدۂ صبر آزما کیوں؟ یہ، کافر، فتنۂ طاقت رُبا کیا!

بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

◆

در خورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
رُوبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیٔ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے، جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے، اور جزو میں کُل!
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑینگے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

* * *

اسدؔ! ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو، پشت خار اپنا

○

پئے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست رُسوا بیوفائی کا
بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکاتِ حسن دے، اے جلوۂ بینش! کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جُرم، غافل، تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ، حق آشنائی کا
تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مِٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا
وہی اِک بات ہے جو یاں نفَس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
دہانِ ہر بُتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بیوفا! چرچا ہے تیری بیوفائی کا
نہ دے نامے کو اتنا طول، غالبؔ! مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں، عرضِ ستم ہائے جدائی کا

○

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہوجائے گا
بے تکلف داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہوجائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتو مہتاب، سیلِ خانماں ہوجائے گا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پانو کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجائے گا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہوجائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہوجائے گا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں، جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر، ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

وائے! گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ!
دوستیِ ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

◆

دردِ مِنّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزماتے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا، روانہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؟
لے کے دل دل ستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیے، کہ لوگ کہتے ہیں
"آج غالبؔ غزل سَرا نہ ہوا"

○

گِلہ ہے، شوق کو، دل میں بھی تنگیِ جا کا
گُہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو، اور پاسخِ مکتوب!
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے، عیش دنیا کا

غمِ فراق میں، تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو، کام چشمِ بینا کا

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا!

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یادؔ اسدؔ!
جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

* * *

قطرۂ مے، بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے، سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ! لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

ہوئی مدّت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر یک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

○

یک ذرّۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے، کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ، ہیں خندہ ہاے گل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دُودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل، ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سُراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار، خُمکدہ کس کے دماغ کا!

○

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں، میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرہ عَرَق، دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخُو ہوگا
نبضِ کس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل، تادمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اِس قدر آساں سمجھا
دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار اسدؔ!
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

○

پھر، مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر، ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی، اے حسرتِ دل!
نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا
زندگی، یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ، وہ جراتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دل گُم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!
دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں، اسدؔ!
سنگ اُٹھایا تھا، کہ سر یاد آیا

○

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا!

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گِلہ
اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا؟

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زُلف کی یاد
ہاں کچھ اِک رنج گراں باریِ زنجیر بھی تھا

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا!
بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اُس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر کوئی
گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس، نہ آیا، نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا!

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ!
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

○

لبِ خشک در تشنگی مُردگاں کا   زیارت کدہ ہوں دلِ آزردگاں کا
ہمہ نا امیدی، ہمہ بدگمانی   میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

○

تو دوست کسی کا بھی، ستمگر! نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خُرشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت، ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں مُعتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی، اسدؔ! داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

○

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر، یارب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا، جز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ، گویا یک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں، بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خون دل، بے منت کیموس تھا

○

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا!
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اُس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا

○

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ، در خورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی، اے دل! اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا
بر رُوے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستمہاے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہواے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل، سواے حسرتِ حاصل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر، اسدؔ!
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

○

رشک کہتا ہے کہ، اُس کا غیر سے اخلاص حیف!
عقل کہتی ہے کہ، وہ بے مہر کس کا آشنا!

ذرّہ ذرّہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلا آشنا

شوق، ہے ساماں ترازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

میں، اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ، ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا، اسدؔ!
سنگ سے سر مار کر، ہووے نہ پیدا آشنا

◆

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا
مَے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب!
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
منظر اِک بلندی پر اور، ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا، کاشکے مکاں اپنا!
دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالینگے
بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں، اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں اُن کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مِٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
تنگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا، غالبؔ! دشمن آسماں اپنا

○

سُرمۂ مُفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم!
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

○

غافل، بہ وہمِ ناز، خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ زدام جستہ ہے اس دامگاہ کا
رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل، خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا
جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے، اسدؔ!
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

○

جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا!
کہتے ہیں، ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!

رات دن گردش میں ہیں، سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا!

لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا!

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا!

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا!

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر، دیکھیے دکھلائیں کیا!

پوچھتے ہیں وہ کہ، غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

○

لطافت بے کثافت، جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن، زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا، نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

○

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہو جانا

تجھ سے، قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا، بات کے بنتے ہی، جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مِٹ گیا گھِسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ!
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں، پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے، ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوَس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ!
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا

ب

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا، موجِ شراب

پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے، اگر
موجِ ہستی کو کرے، فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا موجِ شراب

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بہ دمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپر رنگ سے ہے بالِ کشا موج شراب

موجۂ گل سے، چراغاں ہے گزر گاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نُما موجِ شراب

نشے کے پردے میں، ہے محوِ تماشا سے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سر نشوونما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیت فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے، زہے موسمِ گل!
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب!

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ، اسدؔ!
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

ت

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی تری، چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دِکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
لکھتا ہوں، اسدؔ! سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

○

رہا گر کوئی تا قیامت، سلامت   پھر اِک روز مرنا ہے حضرت سلامت!
جگر کو مرے، عشق خونا بہ مشرب   لکھے ہے خداوندِ نعمت! سلامت
علی الرّغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں   مُبارک مُبارک، سلامت سلامت
نہیں گر سر و برگِ اِدراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت، سلامت

○

مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، غالب!
یار لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت

○

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دُودِ شمعِ کُشتہ تھا، شاید خطِ رُخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش! ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم، ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں، بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کُشتۂ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن، کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

ق

غیر یُوں کرتا ہے میری پُرسِش ، اُس کے ہجر میں
بے تکلّف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تا کہ میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چُپکے چُپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے، اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجیے سپاسِ لذّتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں، غالبؔ! زبس تکرارِ دوست

ج

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قُمری کا طوق، حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

* * *

لو، ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
اچّھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

چ

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل
کیا ہے کِس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس
بہ کوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعت ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

د

حُسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بُتاں پر، یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حِنا میرے بعد

در خورِ عرض نہیں جوہرِ بے داد کو جا
نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہل جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ!
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ر

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

نہیں ہے سایہ، کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دُکانِ متاعِ نظر در و دیوار

ہُجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسایے میں تو سایے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ، نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار

○

گھر، جب بنا لیا ترے در پر، کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
"جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر، کہے بغیر"

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ، جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام "ستم گر" کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے، دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مُشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دونا ہو التفات
سُنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

غالبؔ! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

○

کیوں جل گیا نہ، تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروے عشق، جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں، تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ، خون خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زُنّار باندھ، سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رَہرَو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

اِن آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گِرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

○

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے، جس کے، نہ ہووے مُہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا
کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز، کیا باقی رہا ہو گا!
قیامت اِک ہوائے تُند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

○

ہے بسکہ ہر اِک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرّر، مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم، جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونا بہ فشاں اور

مرتا ہوں اِس آواز پہ، ہر چند کہ سر اُڑ جائے
جلاّد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ’’ہاں‘ اور‘‘

لوگوں کو ہے خُرشیدِ جہانتاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغِ نہاں اور

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن، آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

* * *

صفائے حیرتِ آئینہ‘ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر، آبِ برجا ماندہ کا‘ پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

* * *

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن‘ کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے‘ تہمت نگہ کی‘ چشمِ روزن پر
فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک‘ ہے موقوف گلخن پر
اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ ”مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر“

○

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلّف برطرف، مِل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

○

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھِسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو: قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں، اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بِگڑتا، جو نہ مَرتا کوئی دِن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے!
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دِن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّرؔ سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہرحال یہ مدّت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں" غالبؔ!
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ز

فارغ مجھے نہ جان، کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے نازِ مُفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گُل فروشِ شوخیِ داغِ کُہن ہنوز

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بُتِ بیداد فن ہنوز

○

حریف مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یا رب! کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

○

وصال جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرداز
ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز
نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں، غالبؔ!
جہاں یہ کاسۂ گردوں، ہے ایک خاک انداز

○

وسعتِ سعی کرم دیکھ کہ سرتا سرخاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تبِ گرمیِ رفتار ہنوز

○

کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز!
دِل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنیگی غالب!
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

○

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تُو، اور آرائشِ خمِ کاکل
میں، اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکیں: فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں، اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا غمزۂ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم، سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر، مُبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا، تو کچھ غضب نہ ہُوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا، وہ رند شاہد باز!

س

مژدہ، اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا
جُوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اِس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے
دُشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گُل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی، ہے ہے!
بیٹھنا اُس کا وہ، آ کر، تری دیوار کے پاس

ش

نہ لیوے، گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگائے خانۂ آئینہ میں رُوے نگار آتش

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش

ع

جادۂ رہ خُور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

◆

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گُل آبِ زندگانیِ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں، ہے مرگِ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

غم اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلے!
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

ترے خیال سے روح اِہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گُلِ خزانیِ شمع

جلے ہے، دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

ف

بیمِ رقیب سے نہیں و داغِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف!

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اِک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفَسِ شعلہ بار حیف!

ک

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بُلبل کا درد اور خندۂ گُل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ واہ!
✓ یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

✓ چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پَے توفیرِ درد
زخم، مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں غالبؔ! تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
✓ زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

○

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہوتے تک

دام ہر موج میں، ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہوتے تک

عاشقی صبر طلب، اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہوتے تک

پر توِ خُور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں، ایک عنایت کی نظر ہوتے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل!
گرمیِ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہوتے تک

غمِ ہستی کا، اسدؔ! کس سے ہو جُز مرگ، علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

گ

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مُدّعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مُجھ سے مرے گُنہ کا حساب، اے خدا نہ مانگ

ل

ہے کِس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل
بُلبل کے کاروبار پہ، ہیں خندہ ہائے گُل

آزادیِ نسیم مُبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے، نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل!

خوش حال اس حریف، سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل، سر بہ پائے گل

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نَفَس عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالبؔ! مجھے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال، ہے گلِ جیبِ قبائے گل

م

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفَس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں وَرق گردانیِ نیرنگِ یک بُتخانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں
ہیں چراغان، شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّت مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں، اسدؔ!
جانتے ہیں سینۂ پُر خوں کو زنداں خانہ ہم

○

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

○

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے، مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زُلف کمیں میں ہیں، اے خدا!
رکھ لیجو میرے دعویِ وارستگی کی شرم

ن

لوں دام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش، ولے
غالبؔ! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

○

وہ فراق اور وہ وصال کہاں   وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے   ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا   شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے   اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں، لہو رونا   دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق   واں جو جائیں، گرہ میں مال کہاں
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں   میں کہاں! اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ، غالب!
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

○

کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش ہے
اور پھر کون سے نالے کو رَسا کہتے ہیں؟

ہے پرے سَرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو، اہلِ نظر، قبلہ نُما کہتے ہیں

پائے افغار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مِہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہَوا کہتے ہیں

دیکھیے، لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا، کہتے ہیں

◆

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گِریہ! کچھ باقی مرے تن میں ہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی، ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

زخم سِلوانے سے، مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اِک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گُل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ، اِک ہیولیٰ ہے، نئے ناسور کا
خوں بھی، ذوقِ درد سے، فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود!
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا، غالبؔ! کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلّف، ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

○

عُہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
گر ایک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں، چشم ہائے کُشادہ بسُوئے دل
ہر تارِ زُلف کو، نگہِ سُرمہ سا کہوں

میں، اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو، اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ظالم! مرے گُماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہَے ہَے، خُدا نکردہ، تجھے بیوفا کہوں!

◆

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر مِلتا ہی نہیں مجھ کو سِتمگر، ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

○

ہم سے کُھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑینگے، رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اِس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں،
رنگ لاویگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہاے غم کو بھی، اے دل! غنیمت جانیے
بے صدا ہوجائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے، غالبؔ! پیش دستی ایک دن

○

ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گُماں نہیں
اِک چھیڑ ہے، وگر نہ مُراد اِمتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اِس لطفِ خاص کا
پُرسِش ہے، اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو سِتم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

ق

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پُشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں، مُطربِ ترانۂ "ھَلْ مِنْ مَّزِیْدْ" ہے
لب، پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دونیم
دل میں چُھری چُبھو، مِژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل، نفس اگر آزرفشاں نہیں

نقصاں نہیں، جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو، کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں!
گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ، ولے کیوں کہے، ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

◆

مانعِ دشت نوردی، کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے، مرے پانو میں زنجیر نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ، غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جُز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید! گوارا رہیو!
خوش ہوں گر نالہ زبونیِ کشِ تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالبؔ! اپنا یہ عقیدہ ہے، بقولِ ناسخؔ
"آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میرؔ نہیں"

* * *

مت مردُمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں   ہیں جمع سویداے دل چشم میں آہیں

* * *

برشکالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گُل سو جا سے دیوارِ چمن
اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعویِ وارستگی
سَرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

* * *

عشق تاثیر سے نومید نہیں   جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے   جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری سامانِ وجود   ذرّہ بے پرتوِ خُرشید نہیں
رازِ معشوق نہ رُسوا ہوجائے   ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے   غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

○

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

دل آشفتگاں، خالِ کُنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اِک قدِّ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سُراغِ نالۂ لے داغِ دل سے
کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس، غالبؔ!
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

* * *

ملتی ہے خوئے یار سے نارُ التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں، آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں، خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے، کس پیچ و تاب میں

میں، اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے
جال نذر دینی بھول گیا اِضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اِک شِکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے!
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر، مدّعا طلبی میں نہ کام آئے!
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ! چھُٹی شراب، پر اب بھی، کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

○

کل کے لیے، کر آج نہ خِسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل، کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے، دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رَخشِ عمر، کہاں دیکھیے، تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں!

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم ایک ادائے ناز ہے، اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیب غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ! ندیمِ دوست سے آتی ہے بُوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگی بُوتراب میں

○

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اِک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے رہگزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے، میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اِک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پُوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں؟

پھر بیخودی میں بُھول گیا راہِ کوے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہُنر کو میں

غالبؔ! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گُہر کو میں

* * *

ذکر میرا، بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق!
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مُطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

حسرت، اے ذوقِ خرابی! کہ وہ طاقت نہ رہی
حقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

ظلم کو ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
واے! وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

ہوں ظہوریؔ کے مقابل میں خفائیؔ غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجّت ہے کہ "مشہور نہیں"

○

نالہ جز حُسنِ طلب، اے ستم ایجاد! نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرتگہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث، مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں

واے! محرومیِ تسلیم و بدا! حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گُل و لالہ، پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہگزرِ باد نہیں

سَبَدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ، اے مُرغ! کہ گلزار میں صیّاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اِثبات تراوش، گویا
دی ہی جاے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

کم نہیں، جلوہ گری میں، ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے، ولے اِس قدر آباد نہیں

کرتے کِس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ!
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں!

○

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں!

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ، اہلِ بزم!
ہو غم ہی جاں گداز، تو غمخوار کیا کریں!

○

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

○

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا، "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں!"
دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ!
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

○

دل لگا کر، لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے، اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے، چراغِ رہگزارِ باد یاں

○

یہ ہم، جو ہجر میں، دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے!
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں، اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں!

ترے جواہرِ طرف کلہ کو کیا دیکھیں!
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

○

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے، تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو، تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں
کہ ”آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں!“

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ!
یہ کیا، کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ ”یاد نہیں“

○

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے!
ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل، اے عمر!
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں!
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں، غالبؔ!
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

○

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقّع زیادہ رکھتے ہیں

○

دائم پڑا ہُوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کِس لئے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کِس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زُمرّد و زر و گوھر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ!
رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لئے!
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالبؔ، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے، "نوکر نہیں ہوں میں"

◆

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں

قید میں، یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زُلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اِن پریزادوں سے لیں گے خُلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی، حوریں، اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کُھل گیا
بُلبُلیں سُن کر مرے نالے، غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب! دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے، اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں، بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب!
یاد تھیں جتنی دُعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں

جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم مُوحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
مِلّتیں جب مِٹ گئیں، اجزاے ایماں ہو گئیں

رنج سے خُوگر ہوا اِنساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہلِ جہاں!
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

○

دیوانگی سے، دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہمارے جَیب میں اِک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دُشوار تو یہی ہے کہ، دُشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر، و بالِ دوش
صحرا میں، اے خدا ! کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار، یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مُرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے، اے خدا !
لڑتے ہیں، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہُشیار بھی نہیں

○

نہیں ہے زخم کوئی، بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں، تن میں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
نکوہش، مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب، بخیہ جیب و دامن میں
ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَر افشاں جوہر آئینے میں، مثلِ ذرّہ روزن میں
نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گُل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دیے، جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا، ہر قطرہ خوں تن میں
اسدؔ! زندانیِ تاثیرِ اُلفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے، طوق گردن میں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر، ہو اڑا لے جائے
وگرنہ تاب وتواں، بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے!
کہ غیرِ جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفَسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے، خراب ہیں میکش
شرابخانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ!
کھلا کہ، فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

○

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں!
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں!

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں!

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چُھپائے کیوں!

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں!

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے، آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوش کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں!

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں!

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں!

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں!

○

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ “یوں”
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ “یوں”

“پُرسش طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بِن کہے
اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ “یوں”

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا، تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں، اُس کے رُوبرُو، کیوں نہ خموش بیٹھیے
اُس کی تو خامُشی میں بھی ہے یہی مدّعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے، تہی"
سُن کے، ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ "یوں"؟

مجھ سے کہا جو یار نے، "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟"
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ "یوں"

کب مجھے کوے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج، محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ "یوں"

جو یہ کہے کہ "ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی؟"
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ "یوں"

و

حسد سے، دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو
اگر وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

ہ

کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو!
طاعت میں، تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو
غالبؔ! کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

◆

وارستہ اِس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجئے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
یوں ہو، تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمّت، ہے انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

مِٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صَرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ!
اِس میں ہمارے سَر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو!

○

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی، خدایا! آرزوے دوست دشمن کو

نہ نِکلا آنکھ سے تیری اِک آنسو، اُس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں، مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتلگہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جُنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا، کھیت پر میرے، اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بہ شرطِ اُستواری، اصلِ ایماں ہے
مَرے بُت خانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خُو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لُٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بیخبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جو یا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھو دیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ!
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

◆

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے، ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر، دابتے ہیں، راہزن کے پانو
مرہم کی جستجو میں، پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں، اِس خستہ تن کے پانو
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ، بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے، پانو
ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک کہ، ہر طرف
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مُرغِ چمن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں!
دُکھتے ہیں آج، اُس بُتِ نازک بدن کے پانو
غالبؔ! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

○

واں اُس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

○

واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو مَیں، اور مجھے دل، محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو
ضعف سے، نقشِ پئے مور، ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو!
جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو

یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مُرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا
ہنس کے بولے کہ ”ترے سر کی قسم ہے ہم کو“

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ! ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ، اہم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فُغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

قطعہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کُھلتا، یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سِلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقّع، غالب!
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

◆

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگناہ کُش و حق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں، خُرشید و ماہ ہو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چُھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالبؔ بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دُنیا ہو، یا رب! اور مرا بادشاہ ہو

◆

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو!
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیوں کر ہو!

ہمارے ذہن میں اِس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو!

ادب ہے اور یہی کش مکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گو مگو، تو کیوں کر ہو!

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بُتوں کی ہو اگر ایسی ہی خُو، تو کیوں کر ہو!

اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو، تو کیوں کر ہو!

جسے نصیب ہو، روزِ سیاہ، میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیوں کر ہو!

ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور اُنھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ، تو کیوں کر ہو!

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گُماں تسلّی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیوں کر ہو!

بتاؤ، اُس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو، تو کیوں کر ہو!

مجھے جنوں نہیں، غالبؔ! ولے بقولِ حضور
"فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو!"

○

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنجِ فُغاں کیوں ہو!
نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو!

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ "ہم سے سرگراں کیوں ہو!"

کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو!

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے، نہ ڈر ہمدم!
گِری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو!

یہ کہہ سکتے ہو، ''ہم دل میں نہیں ہیں''، پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو!

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو!

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو!

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو!

کہا تم نے کہ ''کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی''
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں، کیوں ہو!

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!

○

رہیے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا، اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

○

از مہر تابہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ

○

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ
جس کی بہار یہ ہو، پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے
دُشواری رہ و ستم ہمرہاں نہ پوچھ

ی

صد جلوہ رُو بہ رُو ہے، جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اُٹھائیے

دیوار بارِ منّتِ مزدُور سے ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احساں اُٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

○

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بَھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد اے فلک! دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مَے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
بہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رُو، سوئے قبلہ وقتِ مُناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے
نشوونما ہے اصل سے، غالبؔ! فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

○

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے، تکلف سے
تکلف برطرف، تھا یک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دام تمنا میں، ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم!
کہ ہو گا باعثِ افزائشِ دردِ دُروں وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریا سے بیتابی میں ہے اِک موجِ خوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہے اِک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے، غالبؔ! شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

○

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں، زاہد!
زنہار نہ ہونا طرف اِن بے ادبوں سے

بیدادِ وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

○

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں، گو ذِکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ! ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

◆

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اِک حسرتِ تعمیر، سو ہے

◆

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

کُھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا، یا رب!
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لِپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چُھپانے کی

اُنہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا، نہ تھا ظالم! مگر تمہید جانے کی

لکد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت، کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ!
بدی کی اس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

◆

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی!
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بُجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ ناتمامی

◆

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مُور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرَ تو سے آفتاب کے، ذرّے میں جان ہے
حالِ آنکہ ہے یہ سیلیِ خار اسے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مَے کا گمان ہے
کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکاں ہے
کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمازوائے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مِٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ، جگر کا نشان ہے
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اِس قدر
غالبؔ! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

○

درد سے میرے، ہے تجھ کو بیقراری، ہائے ہائے!
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری، ہائے ہائے!

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری، ہائے ہائے!

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دشمنی اپنی تھی، میری دوستداری، ہائے ہائے!

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا!
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری، ہائے ہائے!

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اِسے ناسازگاری، ہائے ہائے!

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہائے ہائے!

شرمِ رسوائی ہے، جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری‘ ہائے ہائے!

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مِل گئی
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری‘ ہائے ہائے!

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اِک لگنے نہ پایا زخمِ کاری‘ ہائے ہائے!

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خُو کردۂ اختر شماری‘ ہائے ہائے!

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تس پر یہ نا امیدواری‘ ہائے ہائے!

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالبؔ! ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری‘ ہائے ہائے!

○

سرگشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک، وہ جانتا ہے، کہ میرے ہی پاس ہے

کیجیے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک
ہر مُو مرے بدن پہ، زبانِ سپاس ہے

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اُس کے پاس دل حق شناس ہے

پی، جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر یک مکان کو ہے مکیں سے شرف، اسدؔ!
مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اُداس ہے

◆

گر خامُشی سے فائدہ اِخفاے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گِلہ
دل، فردِ جمع و خرجِ زباں ہائے لال ہے

کس پردے میں ہے آینہ پرواز، اے خدا!
رحمت، کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے، خدانخواستہ، وہ اور دشمنی!
اے شوق! منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے

مشکیں لباسِ کعبہ، علیؑ کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ!
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

○

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
ولا! یہ درد و الم بھی تو مُغتنم ہے، کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

○

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مِٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر، نہ کیوں!
ہم نہیں جلتے، نفَسِ ہر چند آتش بار ہے
آگ سے' پانی میں بجھتے وقت' اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
ہے وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمین تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے، کہ تا
تجھ پہ کھُل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

○

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

○

مری ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمدم!
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے!

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا، عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

○

رحم کر، ظالم! کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا، دودِ چراغِ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی، سودِ چراغِ کشتہ ہے

○

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سُرمہ، تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ، گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے

دست گاہِ دیدۂ خوںبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل، فرشِ پا انداز ہے

○

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

قطع کیجیے نہ، تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں، ہے کیا رُسوائی؟
اے، وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے!
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی نہیں

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے، اے فلکِ نا انصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے، اسدؔ!
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

○

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن، ہے خندۂ دنداں نما مجھے

ڈھونڈے ہے اُس مُغنّیِ آتش نَفَس کو جی
جس کی صدا، ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں، رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مُدّعا مجھے

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ!
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

○

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری‘ غالبؔ!
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ‘ خدا رکھتے تھے

○

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں، اور جاؤں‘ در سے ترے‘ بن صدا کیے!

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدّت ہوئی ہے، دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے!

مقدور ہو، تو خاک سے پوچھوں کہ، اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے؟

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں، یہ خُو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

ضِد کی ہے اور بات، مگر خُو بُری نہیں
بُھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالبؔ! تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے، اور وہ سُنا کیے

○

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اِضطراب ہے
اِس سال کے حساب کو برقِ، آفتاب ہے

مینائے مے ہے سرو، نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیِ، رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو، اُس برقِ حُسن کا
جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے

میں نامراد، دل کی تسلّی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسدؔ! مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

○

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب، وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے، واہ واہ!
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ، وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور، یاں
مثلِ نقشِ مدّعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کُھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا، مجھ سے مثلِ دُور بھاگے ہے، اسدؔ!
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے!

◆

گرمِ فریاد رکھا، شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی، بردلیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت، معلوم!
لے لیا مجھ سے مری ہمّتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت، ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر اِن اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

◆

کار گاہِ ہستی لالۂ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی، خوابِ گُل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے!
داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بہ دنداں ہے

◆

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ، غالب!
ہم بیاباں میں ہیں، اور گھر میں بہار آئی ہے

◆

سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے، ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا، مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی! خاک میں مل جائے گی
یہ جو اِک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے، واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت، کس کی آب و گِل میں ہے؟

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ، کس مشکل میں ہے

○

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضا مند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراغ!
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں!
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری، کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا! ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی، کیا گُل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظّارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا ودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ، ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے، اسد اللہ خاں! تمہیں
وہ وَلولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

○

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر مِلے
حورانِ خُلد میں تری صورت گر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن، اے ندیم!
میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

○

کوئی دن، گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتش دوزخ میں، یہ گرمی، کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں، اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں، غالبؔ! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

◆

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتا
موت کا ایک دن مُعیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟
ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے، غالبؔ!
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

○

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اِس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مُشتاق، اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ ”مُدّعا کیا ہے؟“

ق

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زُلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں؟
اَبر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ!
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

○

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے
اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وُہ آئے

ہوں کش مکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت!
کچھ کہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

ظاہر ہے کہ، گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

جلّاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے، جس بھیس میں جو آئے

ہاں، اہلِ طلب! کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس دَر پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے

کی ہم نفَسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالبؔ!
ہم بھی گئے واں، اور تری تقدیر کو رو آئے

○

پھر کچھ اِک دل کو بیقراری ہے   سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن   آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز   پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشمِ دلّالِ جنسِ رُسوائی   دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی، صد رنگ نالہ فرسائی   وہی، صد گونہ اشکباری ہے
دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر   محشرستانِ بیقراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے   روز بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

پھر کُھلا ہے درِ عدالتِ ناز   گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر   زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال   ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب   اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا   آج پھر اُس کی روبکاری ہے

بیخودی، بے سبب نہیں، غالبؔ!
کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے

○

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو، فرصت روانی کی
پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گُل فشانی کی

○

نکوہش ہے سزا، فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نُما ہو صبحِ محشر کی!
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ، دہقاں نوک نشتر کی
پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض، کیا قُدرت!
کہ طاقت اُڑ گئی، اُڑنے سے پہلے، میرے شہپر کی
کہاں تک رُوؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مِری قسمت میں، یارب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

○

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دامِ سخت، قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر!
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی، کہ دہر میں
تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے، جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ ری تیری تندیِ خو! جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترک نبرد عشق
جو پانو اُٹھ گئے، وہی اُن کے عَلَم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے، تو عاشق اہلِ کرم ہوئے

○

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے، بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں، جس نے نہ سُنی مری کہانی
یوں ہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا
کہ "مرے عدو کو، یا رب! ملے میری زندگانی"

○

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق! ہاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا!
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہِ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

* * *

اے تازہ واردانِ بساطِ ہواے دل!
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ ناے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی، بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مُطرب، بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوق صداے چنگ
یہ جنت نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر، تو بزم میں
نے وہ سُرور و سُور، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ! صریرِ خامہ، نواے سروش ہے

○

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خُمار نہیں ہے

گِریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہاے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عُشاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اُٹھا لُطفِ جلوہ ہاے معانی
غیرِ گُل آئینۂ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے
واے، اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے، غالبؔ!
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

◆

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
رفوے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ گُل کا، صدائے خندۂ دل ہے

◆

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مُو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ، لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

○

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

سایے کی طرح ساتھ پھریں سَرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر!
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آینہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سُوکھ گئی پیاس سے، یا رب!
اِک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے، جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زُنّار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے، دلِ ناداں!
جب اِک نفَس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طِلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ! مرے اشعار میں آوے

◆

حُسنِ مہ، گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خُرشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں، اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ 'مُفت آئے تو مال اچھا ہے'

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں، تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا، جس کو نہ ہو خُوئے سوال، اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ، بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے، پاتے ہیں عُشّاق بُتوں سے کیا فیض!
اِک برہمن نے کہا ہے کہ‘ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال، اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے، تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ‘ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے، جنّت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو‘ غالب! یہ خیال اچھا ہے

◆

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

خار خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے
شوق گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی

مے پرستاں! خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے، گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی، غالبؔ! اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

○

عجب نشاط سے، جلاد کے چلے ہیں ہم، آگے
کہ اپنے سایے سے سَر، پانو سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا، خرابِ بادۂ اُلفت
فقط ”خراب“ لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے، داد اِس جُنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو، اے طرّہ ہائے خم بہ خم! آگے

دل و جگر میں پَر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں، غالبؔ!
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم، آگے

◆

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اِک زرا چھیڑیئے پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے، سرگرم جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا، پَرے عرش سے میرا، اور اب
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

قطعہ

خامہ میرا، کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے!

اے شہنشاہِ کواکب سپہ مہر علم!
تیرے اِکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجیے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پہ ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیوٗ غالبؔ! مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

○

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کو ”تو کیا ہے“؟
تمہیں کہو کہ ”یہ اندازِ گفتگو کیا ہے“؟

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خُو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگر نہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا
کُریدتے ہو جو اَب راکھ، جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے، ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز، جس کے لیے ہم کو ہو، بہشت عزیز
سوائے بادۂ گُلفامِ مشکبُو، کیا ہے!

پیوں شراب، اگر خُم بھی دیکھ لُوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبُو کیا ہے!

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ، آرزو کیا ہے!

ہوا ہے شہ کا مُصاحب، پھرے ہے اِتراتا
وگر نہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

○

میں اُنہیں چھیڑوں، اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے، جو مے پیے ہوئے

قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاش کے، تم مرے لئے ہوتے!

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب! کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر، غالبؔ!
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

○

غیر لیں محفل میں، بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تُم سے کیا شکوہ، کہ یہ
ہتکھنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مَے، اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ اِحرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے؟

شاہ کے ہے غُسلِ صحت کی خبر
دیکھیے، کب دن پھریں حمام کے!

عشق نے غالبؔ! نِکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

○

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک! اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر رُو کشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا رُوئے آپ پر کائی
سبزہ و گُل کے دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی، ہے باد پیمائی
کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی، غالبؔ!
شاہِ دیندار نے شفا پائی

○

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے

رہا آباد عالم، اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبُو، میخانہ خالی ہے

○

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ!
دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا، روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں زخود رفتۂ بیداے خیال
بھول جانا ہے، نشانی میری
متقابل ہے، مقابل میرا
رُک گیا، دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں، ہے گرانی میری
گرد بادِ رہِ بیتابی ہوں
صرصرِ شوق، ہے بانی میری
دہَن اُس کا، جو نہ معلوم ہوا
کُھل گئی ہیچ مدانی میری
کر دیا ضُعف نے عاجز، غالبؔ!
ننگِ پیری ہے جوانی میری

◆

نقشِ نازِ بتِ طناز، بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
تو وہ بد خو کہ، تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ، آشفتہ بیانی مانگے
وہ تبِ عشق تمنا ہے کہ، پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

◆

گلشن کو تری صحبت از بس کو خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا، آغوش کشائی ہے
واں کنگرِ استغنا، ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے
از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا، اک چشم نمائی ہے

◆

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لِکھ دیجیو یا رب! اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگشتِ حِنائی کا تصور
دل میں نظر آتی ہے اک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشّاق کی بے حوصلگی سے؟
یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کسُو کی ۱

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف وہ ناکام، کہ اِک عمر سے غالبؔ!
حسرت میں رہے ایک بُتِ عَربدہ جُو کی

○

سیماب، پُشت گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

آغوشِ گُل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

ہے وصل، ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

◆

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جاے مَے، اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل!
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر، جیب، بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

دوستی کا پردہ، ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دُشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دُشمن ہے، دیکھا چاہیے

اپنی رُسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

مُنحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

غافل! اِن مہہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

○

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے، بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے، شب تنہائی میں
صورتِ دُود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو، سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو!
پُر ہے سایے کی طرح، میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے
ہونگہ، مثلِ گُلِ شمع، پریشاں مجھ سے

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے، ہے!
سایہ خُرشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں، تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں، مجھ سے

نگہِ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے، اسدؔ!
ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

○

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل!
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ، اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

اِس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں، تو کیا
ہاتھ آئیں، تو اُنہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بُلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گِرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ!
کہ لگائے نہ لگے، اور بُجھائے نہ بنے

◆

چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عُریانی کرے
صبح کے مانند، زخمِ دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ، گر کیجیے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب! کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گرانجانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
مُوے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے، لِکھا ہے زُلف کو اُلفت نے عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

○

وہ آ کے، خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دِکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کو ہم کر
نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اُوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے

اسدؔ! خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اُس نے، ”زرا میرے پانو داب تو دے“

○

تپش سے میری، وقفِ کش مکش، ہر تارِ بستر ہے
مِرا سر رنجِ بالیں ہے، مِرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا اُفتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بُو بالش سے، اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو، خوابِ زلیخا، عارِ بستر ہے

کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں، غالبؔ!
کہ بے تابی سے ہر یک تارِ بستر، خارِ بستر ہے

* * *

خطر ہے، رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دُشمن نہ ہو جائے
سمجھ اِس فصل میں کوتاہی نشو و نُما، غالبؔ!
اگر گُل سَرو کے قامت پہ، پیراہن نہ ہو جائے

* * *

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغباں تو نبے؟
گر باغ گدائے مَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے
پر تجھ سی کوئی شَے نہیں ہے
ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی!
ہر چند کہیں کہ، ہے نہیں ہے
شادی سے گُزر کہ، غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو، تو دَے نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے، زاہد!
مَے ہے یہ مگس کی قَے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے غالبؔ!
آخر تو کیا ہے، ”اَے نہیں ہے؟“

* * *

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

○

ہم رشک کو اپنے بھی، گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ اُنہیں غیر سے، ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدی، اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

○

کرے ہے بادہ، ترے لب سے، کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ، سراسر نگاہِ گلچیں ہے
کبھی تو اِس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے!
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے، گر نہ سُنے، نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گُل، نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
اسدؔ ہے نزع میں، چل بیوفا! برائے خدا!
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

○

کیوں نہ ہو چشمِ بُتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟
یعنی اِس بیمار کو نظّارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گُل دیکھ، رُوئے یار یاد آیا، اسدؔ!
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

○

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے
ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے، اور آئے بِن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کِس قدر ہے، کیا کہیے!

رہے ہے یوں گہہ و بے گہہ، کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟

زہے کرشمہ! کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بِن کہے ہی اُنہیں سب خبر ہے، کیا کہیے!

سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں، وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ، سرِ رہگزر ہے، کیا کہیے؟

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے، کیا، کہیے!

اُنہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟

حسد، سزاے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے
ستم، بہاے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے!

کہا ہے کس نے کہ، غالبؔ برا نہیں، لیکن
سواے اِس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے

○

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عُریانی' مجھے

بن گیا تیغِ نگاہیار کا سنگِ فساں
مرحبا میں! کیا مُبارک ہے گراں جانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

میرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی' مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافرؔ نہ ہوتا' کاشکے!
اِس قدر ذوقِ نوائے مُرغِ بُستانی مجھے

وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے؟

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری' واہ واہ!
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نَو زندگی
میرزا یوسفؔ ہے، غالبؔ! یوسفِ ثانی مجھے

○

یاد ہے شادی میں بھی، ہنگامۂ یارب، مجھے
سُبحۂ زاہد ہوا ہے، خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کُشادِ خاطرِ وابستہ دَر، رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانہ مکتب مجھے

یارب! اِس آشفتگی کی داد کِس سے چاہیے!
رشک، آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں!
آرزو سے، ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے

○

حضورِ شاہ میں، اہلِ سخن کی آمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی!
اُسے یوسف کی بُوے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ "غافل تھے"
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر
غرض شِستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سُبحہَ و زُنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ! بیتابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زُلفِ پُر شکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو!
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آویں گے مِرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالبؔ!
نئے فِتنوں میں اب چرخِ کُہن کی آزمائش ہے

○

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں، گر آ جائے ہے، مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے، مجھ سے
خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے!
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے، مجھ سے
وہ بدخُو، اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے، مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے، مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی! کیا قیامت ہے!
کہ دامانِ خیالِ یار، چھُوٹا جائے ہے، مجھ سے
تکلف بر طرف، نظّارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے، مجھ سے
ہوئے ہیں پانو ہی پہلے، نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے، مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہمسفر غالبؔ!
وہ کافر، جو خُدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے!

○

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بست مژہ، سیلیِ ندامت ہے

نہ جانوں، کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بد عہدی
تجھے کہ آینہ میں بھی ورطۂ ملامت ہے

بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل، قیامت ہے!

○

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا، دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دِکھلا وے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زُلف گر بن جاؤں، تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

○

بازیچۂ اطفال ہے، دنیا، مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا، مرے آگے

اِک کھیل ہے، اورنگِ سلیماں، مرے نزدیک
اِک بات ہے، اعجازِ مسیحا مرے آگے

جُز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں، ہستیِ اشیا، مرے آگے

ہوتا ہے نہاں، گرد میں، صحرا، مرے آگے
گِھستا ہے جبیں خاک پہ، دریا، مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو، خودبین و خودآرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بُتِ آینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گُزرا
کیوں کر کہوں، ''لو نام نہ اُن کا مرے آگے''

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یُوں مر نہیں جاتے!
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اِک قلزمِ خوں، کاش! یہی ہو
آتا ہے ابھی، دیکھیے، کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو، اچھا، مرے آگے؟

◆

کہوں جو حال، تو کہتے ہو، ''مدّعا کہیے''
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم، کہ ''تم ستمگر ہیں''
مجھے تو خُو ہے، کہ جو کچھ کہو، ''بجا کہیے''

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مدّعی بنے، اس کے نہ مدّعی بنیے
جو نا سزا کہے، اُس کو نہ نا سزا کہیے

کہیں حقیقتِ جان کا ہی مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجئے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان’ تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو اُلفت’ نہ ہو، نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ!
خدا سے کیا ستم و جورِ نا خُدا کہیے!

○

رونے سے، اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

صَرفِ بہائے مے ہوئے، آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

رُسوائے دہر گو ہوئے، آوارگی سے، تم
بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟
پردے میں گُل کے، لاکھ جگر چاک ہو گئے

پُوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا!
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گِلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ، بس خاک ہو گئے

اِس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

○

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے، سروِ سبزِ جویبارِ نغمہ ہے
ہمنشیں مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست"
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

○

حُسنِ بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوے فکرِ اِختراعِ جلوہ ہے
تا کجا، اے آگہی! رنگِ تماشا باختن؟
چشمِ واگرویدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

○

عرضِ نازِ خموشیِ دنداں، برائے خندہ ہے
دعویِ جمعیتِ احباب' جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ' محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

کُلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
ورنہ دنداں وہ دل افشُردن' بنائے خندہ ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

○

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کو تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرّۂ لیلا کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں، درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو، عقدۂ دل وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے، جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رُسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار، شاخِ گُل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ناکامیِ نگاہ، ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ، تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت، ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سَر بَر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ، تیری تمنا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ، نہ پیدا کرے کوئی

بیکاریِ جنوں کہ، ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے، اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

○

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟

چال، جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی!

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ!
کچھ نہ سمجھے‘ خدا کرے کوئی

نہ سُنو، گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی

روک لو، گر غلط چلے کوئی
بخش دو، گر خطا کرے کوئی

کون ہے، جو نہیں ہے حاجتمند؟
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے!
اب کسے رہنما کرے کوئی؟

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ!
کیوں کسی کا گِلا کرے کوئی؟

○

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے!
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے!

تمہاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم، کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟

کٹے، تو شب کہیں؛ کاٹے، تو سانپ کہلا دے
کوئی بتاؤ کہ، وہ زُلفِ خم بخم کیا ہے؟

لکھا کرے کوئی، احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ، وہاں جنبشِ قلم کیا ہے!

نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و مِلّت کا
خدا کے واسطے، ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے، ہمدم!
وگرنہ مہرِ سُلیمان و جام و جم کیا ہے!

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

○

باغ، پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

مُدّعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

نالہ، سرمایۂ یک عالم و عالم، کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں، اب مرگئے پر، کون اٹھاتا ہے مجھے؟

◆

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہر یار کی
اترائے کیوں نہ خاک، سرِ رہگزار کی
جب اس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، ولے
کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

◆

کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جائیے
بے تکلف، اے شرارِ جستہ! کیا ہو جائیے
بیضہ آسا تنگ بال و پَر پہ ہے کنجِ قفس
از سَرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

◆

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل، کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے، عمر بھر یُوں دم بدم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا۔ سُنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے، ظالم! تیرے قامت کی درازی کا
اگر اُس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اِس دَور میں منسوب مجھ سے، بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقّع، خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ سِتم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق، جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دَم، نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ، غالبؔ! اور کہاں واعظ!
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

○

مستی بہ ذوقِ غفلت ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب، یک مژۂ خواب ناک ہے
جُز زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسدؔ!
صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے

○

لبِ عیسیٰ کی جُنبش، کرتی ہے گہوارہ جُنبانی
قیامت، کُشتۂ لعلِ بُتاں کا خوابِ سنگیں ہے

○

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنگلی جادہ سے
بزمِ مے، وحشت کدہ ہے، کس کی چشمِ مست کا؟
شیشہ میں نبضِ پری پنہاں ہے، موجِ بادہ سے

* * *

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برآوے

* * *

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

* * *

ہجومِ نالہ، حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
تکلف برطرف، ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف، کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید، مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے
دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا ہے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے، عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

○

خموشیوں میں، تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہِ دل سے ترے، سُرمہ سا نکلتی ہے

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

○

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ، دماغِ آہوے دشتِ تتار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو؟ اے خدا!
آئینہ فرشِ ششِ جہتِ انتظار ہے

ہے ذرّہ ذرّہ تنگیِ جا سے غُبارِ شوق
گردام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

دل مدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ
نظّارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گُل پر آب
اے عندلیب؛ وقتِ وداعِ بہار ہے

پَچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سُوے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب! یک کفِ خس بہر آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی
اے بے دماغ! آئینہ تمثال دار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے

○

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا، تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ، سُویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں، اے خدا!
افسونِ انتظار تمنّا کہیں جسے

سر پر، ہجومِ دردِ غریبی سے، ڈالیے
وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے

درکار ہے، شگفتنِ گُلہائے عیش کو
صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے

غالبؔ! بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ، سب اچھا کہیں جسے؟

○

شبنم بہ گلِ لالہ، نہ خالی زادا ہے
داغِ دلِ بیدرد، نظر گاہِ حیا ہے

دل خوں شُدۂ کش مکش حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بُتِ بد مستِ حنا ہے

شعلہ سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے؟

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ، بہ اندازِ گُل، آغوش کُشا ہے

قُمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ، نشانِ جگر سوختہ کیا ہے؟

خُو نے تری افسردہ کیا، وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی، طُرفہ بلا ہے

مجبوری و دعواے گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ، پیمان وفا ہے

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم، آئینۂ تصویر نما ہے

اے پرتوِ خُرشید جہانتاب! ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو، غالبؔ!
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان! خدا ہے

○

منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

اِک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی

واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی!

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا
گویا ابھی سُنی نہیں آوازِ صُور کی

آمد بہار کی ہے، جو بُلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بُتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ، سب کو ملے ایک سا جواب!
آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام ہیں، لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ! گر اِس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

○

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مےِ گلفام، بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
ہے یوں کہ، مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے، نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زُہد کو مانوں کہ، نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد، کس روشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گراب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو
اِنکار نہیں، اور مجھے ابرام بہت ہے
خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ!
رہنے دے مجھے یاں کہ، ابھی کام بہت ہے
ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

○

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہُوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفَس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پُرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظّارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ گوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں، نامۂ دلدار کھولنا
جاں، نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو
سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اِک نو بہارِ ناز کو تا کے ہے پھر، نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے

جی، ڈھونڈتا ہے پھر، وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالبؔ! ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

○

نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے، گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلق، اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اِک جہاں کے لئے

فلک! نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت، مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمّل حسینِ خان کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور مُعینِ مِلّت و مُلک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ ارایش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورَق تمام ہُوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اِس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!

منقبت میں

سازِ یک ذرّہ، نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بیداغ، سُوید اے بہار
مستیِ بادِ صبا سے، ہے بہ عرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے، جوہرِ تیغِ کُہسار
سبز ہے، جامِ زمرّد کی طرح' داغِ پلنگ
تازہ ہے، ریشۂ نارنج صفت' رُوے شرار
مستیِ ابر سے، گلچینِ طرب ہے، حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گُل سے بیدار
سونپے ہے فیضِ ہوا، صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر، بیک سطرِ غبار
کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال
قُوّتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
کف ہر خاکِ بہ گردوں شدہ، قُمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار
میکدے میں ہو اگر آرزوے گُل چینی
بھول جا، یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

موجِ گُل ڈھونڈھ بخلوتکدۂ غنچۂ باغ
گُم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ، چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز، ہو خطِّ پَرکار
لعل سی، کی ہے، پے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ کہ، جس کی پےِ تعمیرِ سَرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلکُ العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار
سبزۂ نُہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمّتِ صد عارت و یک اوجِ حصار
واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پَرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار
خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عُرفاء
چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار
ذرّہ اُس گرد کا، خُرشید کو آئینۂ ناز
گرد اُس دشت کی، اُمید کو، اِحرامِ بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے، ہر موجِ غبار

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے، اے شمعِ شبستانِ بہار!
دلِ پروانہ چراغاں، پر بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار
تیری اولاد کے غم سے ہے بُروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو، مژۂ گوہر بار
ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم، مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو، ترے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری نہاں، زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ، یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگان و دگر سُو غمِ خار
مَردُمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ
خاکِ در کی ترے، جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو، بہ طرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو، طاقِ دیوار
دیدۂ تا دل اسدؔ، آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار

منقبت میں

دہر، جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں
بیدلی ہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا! کہ نہ دُنیا ہے، نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آینۂ فرقِ جنون و تمکیں
نقشِ معنی ہمہ، خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ، پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم!
دُردِ یک ساغر غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دست تسلیم
صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں
عشق، بے ربطی شیرازۂ اجزائے حواس

وصل، زنگارِ رخِ آینۂ حُسنِ یقیں
کوہکن، گر سنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آینۂ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا، اثرِ نالۂ دلہاے حزیں؟
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سرو برگِ ستایش، نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ، عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ لاحول، لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر!
"یاعلی" عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں!
مظہرِ فیضِ خُدا، جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی، کعبۂ ایجادِ یقین
ہو، وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک، ہے واں، گردۂ تصویرِ زمیں
جلوہ پرواز ہو نقشِ قدم اُس کا، جس کا
وہ کفِ خاک' ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رُتبہ کہ رہے
ابداً پُشتِ فلک، خم شدۂ نازِ زمیں
فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا

بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
بُرشِ تیغ کا اُس کی، ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں
کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ، جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بُتخانۂ چیں
جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رُسل تو ہے، بہ فتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے، دوشِ پیمبر، منبر
نامِ نامی کو ترے، ناصیۂ عرش، نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب؟
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہر آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
تیری مدحت کے لیے ہیں، دل و جاں، کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں، لوح و قلم، دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خُدا؟
کس سے ہو سکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں؟
جنسِ بازارِ معاصی، اسد اللہ اسد

کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں، ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں
دے دعا کو مری، وہ مرتبۂ حُسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار، "آمیں"
غمِ شبّیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں، خونِ جگر سے، مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے، اس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہہ جلوہ پرست، و نفسِ صدق گزیں
صرف اعداء، اثرِ شعلۂ دُودِ دوزخ
وقفِ احباب، گل و سنبلِ فردوسِ بریں

○

ہاں مہِ نو! سُنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے، گردشِ ایّام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا، اے سُرورِ خاصِ خواص!
تجذا، اے نشاطِ عامِ عوام!
عُذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صُبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا، کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چُھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟
جانتا ہوں کہ، آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غُلام؟
جانتا ہوں کہ، جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ
قُربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

ق

تجھ کو کیا پایہ رُوشناسی کا
جُز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون!
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو اِنعام

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
ار کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشیگا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مَےِ گلفام!

جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکے قطع تیری تیزیِ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کُوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اِک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مَے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا، یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دُشنام

کعبے میں جا، بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دَیر میں اِحرام

اُس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام

بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا اِبرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام؟

کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تُو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام!

کون ہے، جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل، صورتِ اعجاز جس کا ہر قول، معنیِ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم رزم میں اوستادِ رستم و سام
اے ترا لُطف، زندگی افزا اے ترا عہدِ فرّخی فرجام
چشمِ بد دور! خُسروانہ شکوہ لوحش اللہ! عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے گیو و گودرز و بیژن و رُہّام
مرحبا، ہوشگافی ناوک! آفریں، آب داریِ صمصام!
تیر کو تیرے، تیرِ غیر، ہدف تیغ کو تیری، تیغِ خصم، نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

ق

فنِّ صورتگری میں تیرا گرز گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اُس کے مضروب کے سروتن سے کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا مُجملا مُندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ، نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ، لکھیں
خال کو دانہ اور زُلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام، خسرو روز
ماہِ تاباں کا اِسم، شحنۂ شام
تیری توقیع سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اُس رقم کو دیا طرازِ دَوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

صُبح دم دروازۂ خاور کُھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کُھلا
خسروِ انجم کے آیا صَرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کُھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا
تھی نظر بندی، کیا جب رَدِ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سُلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
شاہِ روشن دل، بہادر شہہ کہ، ہے
رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عُقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

قطعہ

توسنِ شہہ میں وہ خوبی ہے کہ جب
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
تو کہے، بُتخانۂ آزر کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے، لیکن ہر ایک
میری حدِ وسع سے باہر کھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کِس نے کھولا، کب کھلا، کیونکر کھلا؟
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گُستر کھلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نَفَس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یُوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا!
ہم پُکاریں اور کُھلے، یوں کون جائے؟
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں!
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا!
مُفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ!
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک! آگ بھڑکی منہ اگر دم بھر کھلا
نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو، غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی!
ہے ولی پوشیدہ، اور کافر کھلا

پھر، ہوا مِدحت طرازی کا خیال پھر مہہ و خُرشید کا دفتر کُھلا
خامہ سے پائی، طبیعت نے، مدد بادباں بھی، اُٹھتے ہی لنگر کُھلا
مدح سے ممدُوح کی دیکھی شکوہ یاں عَرَض سے رُتبۂ جوہر کُھلا
مِہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب عُلوِّ پایۂ منبر کھلا
سِکّۂ شہ کا ہوا ہے روشناس اب عیارِ آبروے زر کُھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آینہ اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
مُلک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریبِ طُغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح، ہاں اِک نام ہے دفترِ مدحِ جہانِ داور کُھلا
فکر اچھی، پر ستایش ناتمام عجزِ اَعجازِ ستایش گر کھلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ اَزل تُم پہ اے خاقانِ نام آور! کُھلا

تم کرو صاحب قِرانی، جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کُھلا

مثنوی در صفتِ انبہ

ہاں دل درد مندِ زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز!
خامہ کا صفحے پر رواں ہونا
شاخِ گُل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے، کیا لکھیے؟
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے، آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ، نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آدم کا کون مردِ میداں ہے؟
ثمرو شاخ، گوے چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں!
آئے، یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے!
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گُل اس میں نہ شاخ و برگ، نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑایئے قیاس کہاں!
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں!
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن باوجودِ غمگینی

ق

جان دینے میں اس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنّت سے

انگبیں کے بحکمِ ربُّ النّاس
بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ، اور کہاں یہ نخل

تھا ترُنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد، پر کہاں بُو باس

آم کو دیکھتا، اگر اِک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خُلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخِ برگ و بار ہے آم
ناز پروردۂ بہار ہے، آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد
عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں، عزِّ شان و جاہِ جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کار فرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا، ہُما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خُدا کا سایہ ہے

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور
جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اِس خُداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

قطعات

○

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر!
اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل!
پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اِکلیل
تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ اِلہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا، رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بہ سخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بہ کرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زُہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش، مری انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کجباز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل، نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم، نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ، لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ، عمر کی زنبیل
فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کِلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق، توضیح
میرے اِجمال سے کرتی ہے تراوش، تفصیل
نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر!
کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل!

قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ
قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں، کیوں ہم نہ کہتے تھے؟

قطعہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!
وہ سبز زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر!
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے!

در مدحِ ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے!
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے!
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوے شگرفانِ خود آرا کہیے
مسّی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیے
حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اِس کو اگر سمجھیے قافِ تریاقی
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اِسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اِسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اِسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟
کیوں اسے نقطۂ پَر کارِ تمنّا کہیے؟
کیوں اِسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے؟
کیوں اِسے مردُمکِ دیدۂ عنقا کہیے؟
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے؟
کیوں اِسے نقشِ پےِ ناقۂ سلما کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اِس چکنی سُپاری کو سُویدا کہیے

قطعہ

نہ پوچھ اِس کی حقیقت، حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

بیانِ مصنّف

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری، ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رَد ہوں، اور مرا مسلک ہے صُلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفؔر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہہ سے ہو مجھے۔ پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نُما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون، اور ریختہ، ہاں اس سے مدّعا
جُز اِنبساطِ خاطرِ حجرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے، سخن گسترانہ بات
مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو، تو رُوسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شُکر کی جگہ کہ، شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ، جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح

نصرت الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے، تو کس بات سے ہے؟

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونق بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ، گرجی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اِک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں!
یہ دُعا شام و سَحَر قاضی حاجات سے ہے

تو سکندر ہے، مرا فخر ہے مِلنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اِس پہ گزرے نہ گُماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں، اہلِ خرابات سے ہے

○

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صَفر، چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مُشک بُو کی ناند

جو آئے، جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند

غالبؔ! یہ کیا بیاں ہے، بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھ کوئی نوشت خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہاں گیر، جہاں بخشِ جہاندار!
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دُشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدے کو، سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے، کرے خضر سکندر سے ترا ذِکر!
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سُلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سُلیماں جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مُریدی ترا، فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غُلامی ترا، توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے، تابِ شرارت

ڈھونڈھے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دُعا پر
قاصر ہے ستایش میں تری، میری عبارت

نَوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مُبارک
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ، اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے، کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے' تو ناچار کیا کرے

گزارشِ مصنّف بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ!   اے جہاندارِ آفتاب آثار!
تھا میں اِک بے نوائے گوشہ نشیں   تھا میں اِک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی   ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرّہ ناچیز   روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ ازروئے ننگ بے ہنری   ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی   جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں   بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مُرید اور مدّاح   تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر   نسبتیں ہو گئیں مشخّص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں   مدّعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں　　ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر　　تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھ پوشش　　جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال　　کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ، اور دن کو دھوپ　　بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!
آگ تاپے کہاں تلک انساں!　　دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار!
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی　　وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارْ
میری تنخواہ جو مقرر ہے　　اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھماہی ایک　　خلق کا ہے اِسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات　　اور چھماہی ہو سال میں دوبار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض　　اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا　　ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں　　شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیے　　ہے زباں میری، تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے　　ہے قلم میری، ابرِ گوہر بار
ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد　　قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا!　　آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار!
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ　　تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام　　شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

◆

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہوا میرا، شریکِ غالبؔ ہے

◆

سہل تھا مُسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مُسہل سے پہلے، تین دن مُسہل کے بعد
تین مُسہل، تین تبریدیں، یہ سب گے دن ہوئے؟

◆

خُجستہ انجمنِ طوے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں، غالبؔ!
نہ کیوں ہو مادّۂ سالِ عیسوی "محظوظ"

۱۸۵۴ء

○

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے، تاریخ اِس کی کیا ہے؟
تو بولا ”اِنشراحِ جشنِ جمشید“

۱۲۷۰ھ

○

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اِس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات

○

بعد از اِتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایّامِ جوانی رہے ساغر کش حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اِقلیمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ! یک قدم استقبال

○

شب زلف و رُخِ عرَق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طُرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُر نم تھا

○

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لئے گیا ہے کھیل نکال!

○

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بیتابیِ رشک و حسرت دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلّی، افسوس!
تکرار روا نہیں، تو تجدید سہی

○

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لئے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی، ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

○

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اُس سے گِلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالبؔ! منہ بند ہو گیا ہے گویا

○

دُکھ، جی کے پسند ہو گیا ہے، غالبؔ!
دل رُک رُک کے بند ہو گیا ہے، غالبؔ!
واللہ کے شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے، غالبؔ!

○

مشکل ہے زبس کلام میرا، اے دل!
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مُشکل، وگر نہ گویم مُشکل!

* * *

بھیجی ہے جو مجھ کو، شاہِ جمجاہ نے، دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانشِ و داد کی دال

* * *

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم!
ہے اب کے شب قدر و دوالی باہم

* * *

حق، شہ کی بقا سے، خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں، گانٹھ
ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

○

اِس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا!
اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا!
ہر سینکڑے کو ایک گِرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا!

○

کہتے ہیں کہ، اب وہ مردم آزار نہیں
عُشاق کی پُرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

○

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں، کہیں خُدا سے، اللہ اللہ!
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

○

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے، غالبؔ! لیکن
خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں!

○

اِن سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے!
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہہ والا نے
گِن کر دیوینگے ہم دُعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے، ہیں یہ دانے

ضمیمہ

○

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک
ہم سخن اور ہم زباں، حضرتِ قاسمؔ و طپاںؔ
ایک طپشؔ کا جانشیں، دردؔ کا یادگار ایک
نقدِ سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی
شعر کے فن کے واسطے، مایۂ اعتبار ایک
ایک وفا و مہر میں، تازگیِ بساطِ دہر
لطف و کرم کے باب میں، زینتِ روزگار ایک
گُلکدۂ تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بُو
ریختہ کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک
مملکتِ کمال میں، ایک امیرِ نامور
عرصۂ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک

قاسمؔ: اس سے ابوالقاسم خان قاسمؔ مراد ہیں۔
طپاںؔ: مرزا احمد بیگ طپاںؔ مراد ہیں۔
ان دونوں سے کلکتہ کے سفر کے دوران میں ملاقات ہوئی تھی۔

گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں
مے کدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک
زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
کشتۂ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک
دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسولؐ پر فدا
ایک محبِّ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک
جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نو بہار
فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک
لایا ہے کہہ کے یہ غزل، شائبۂ ریا سے دُور
کر کے دل و زبان کو غالبؔ خاکسار ایک

النّاظر (لکھنؤ) دسمبر ۱۹۳۴ء؛ متفرقاتِ غالب: ۱۰۵، ۱۰۶

○

اپنا احوالِ دلِ زار، کہوں یا نہ کہوں!
ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں!

نہیں کرنے کا میں تقریر، ادب سے باہر
میں بھی ہوں واقفِ[1] اسرار، کہوں یا نہ کہوں!

شکوہ سمجھو اسے، یا کوئی شکایت سمجھو[2]
اپنی ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں!

اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاری[3] دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار، کہوں یا نہ کہوں؟

دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمن جانی اپنا[4]
ہوں اِک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟

میں تو دیوانہ ہوں، اور ایک جہاں ہے غمّاز
گوش ہیں درپسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں؟

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے، تو اسدؔ!
حسبِ حال اپنے پھر اشعار، کہوں یا نہ کہوں[5]؟

---

[1] محرم، [2] شکر جو سمجھو اسے یا کوئی روایت سمجھو، [3] عزاداری، [4] میرا۔ [5] گلدستۂ نازنیناں، ص ۲۱۳؛ دیوانِ معروف ۱۶۱-۱۶۲ (متن "دیوانِ معروف" سے لیا گیا ہے اور اختلافات "گلدستۂ نازنیناں" مؤلفہ مولوی کریم الدین (مطبوعہ ۱۸۴۵) پر مبنی ہیں۔

○

ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں، آہوے صیاد دیدہ ہوں

ہوں درد مند، جبر ہو یا اختیا ہو
گہ نالۂ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ، تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نے سُبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے رابطہ[1]
میں معرضِ مثال میں، دستِ بُریدہ ہوں

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے[2] دانۂ فتادہ ہوں، نے[2] دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیے[3]، نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقے[4] میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقے[5] میں، میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ!
ڈرتا ہوں آئینے[6] سے، کہ مَردُم گزیدہ ہوں[7]

---

[1] واسطہ، [2] نے، [3] چاہے، [4] حلقے، [5] زمرے، [6] آئینہ
[7] بیاض علاء الدین احمد خان علائی (قلمی) (رضا لائبریری رامپور)۔

* * *

مجلس شمع عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

ہووے ہے جادۂ رہ، رشتۂ گوہر ہر گام
جس گذر گاہ میں، میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سُبک رَو کے نہ رہنے سے رہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں[۱]

---

[۱] عمدۂ منتخبہ (قلمی) ۹۲

شبِ وصال میں، مُونس گیا ہے بَن تکیہ
ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ

خراج، بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج!
کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پر شکن تکیہ

بنا ہے تختہ و گل ہاے یاسمیں بستر
ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رختِ خواب ہے، پرویں، تو ہے پرَن تکیہ

مزا ملے، کہو کیا خاک، ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر
اُٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگرچہ زانوے نل پر رکھے دمن تکیہ

بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا، کوہکن، تکیہ

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہوتے تک
رکھو نہ شمع پر، اے اہلِ انجمن تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے، لیکن
اُٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ

غش آگیا جو پس از قتل، میرے قاتل کو
ہوئی ہے اُس کو مری نعش بے کفن تکیہ

شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیّت کا
کہ سانپ فرش ہے، اور سانپ کا، ہے من تکیہ

روا رکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ "تکیہ کلام"
اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن، "سخن تکیہ"

ہم اور تم، "فلکِ پیر" جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

◆

میں ہوں مشتاق جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ!
ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اور سہی
تم ہو بُت، پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا، اور سہی
تیرے کوچہ کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نُما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ!
خُلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یارب!
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی
مجھ سے، غالب! یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

○

کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ، کہ وہ زُلفِ خم بخم کیا ہے

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ، وہاں جنبشِ قلم کیا ہے؟

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و مِلّت کا
خدا کے واسطے! ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے، ہمدم
وگرنہ مُہرِ سلیماں و جامِ جم کیا ہے؟

○

آپ نے مَسَّنِیَ الضُّرُّ، کہا ہے تو سہی
یہ بھی یا حضرتِ ایوبؑ، گِلا ہے تو سہی

رنج طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیوں سر
ذہن میں، خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی

ہے غنیمت، کہ بامید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

دوست گر کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری
نہ سہی، ایک تمنائے دوا ہے تو سہی

غیر سے، دیکھیے، کیا خوب نبھائی اُس نے!
نہ سہی ہم سے، پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں، میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالبؔ!
شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

○

لطفِ نظارۂ قاتل، دمِ بسمل آئے
جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے

اُن کو کیا علم کہ، کشتی پہ مری کیا گزری!
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

وہ نہیں ہم، کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ!
ساتھ حجّاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اُٹھتے ہیں
"لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے"

دیدہ خونبار ہے مدّت سے، و لے آج ندیم!
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

سامنا' حور و پری نے، نہ کیا ہے، نہ کریں
عکس تیرا ہی' مگر، تیرے مقابل آئے

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا، غالبؔ!
آج ہم حضرتِ نوّاب سے بھی مل آئے

◆

دیکھ وہ برقِ تبسّم بسکہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا، فوّارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ، بولا مے فروش
"اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے"

◆

ایک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر، ہم جگر جلے
پروانہ کا نہ غم ہو، تو پھر کس لیے، اسدؔ!
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

◆

ذرا کر زور سینے پر، کہ تیرِ پُرستم نکلے
جو وہ نکلے، تو دل نکلے، جو دل نکلے، تو دم نکلے

خمسہ بر غزل

بہادر شاہ ظفرؔ

گھستے گھستے پانوں میں زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر، قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا، کاش! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی
“کھنچ کے، قاتل! جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے، جانِ عاشقِ دلگیر، آدھی رہ گئی”

بیٹھ رہتا، لے کے چشمِ پُرنم، اُس کے رُوبرو
کیوں کہا تو نے کہ کہہ، دل کا غم اُس کے رُوبرو
بات کرنے میں، نکلتا ہے دَم، اُس کے رُوبرو
“کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے رُوبرو
ہم نشیں! آدھی ہوئی تقدیر، آدھی رہ گئی”

تو نے دیکھا، مجھ پہ کیسی بن گئی، اے رازدار!
خواب و بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار!
مثلِ زخم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار

“کھینچتا تھا‘ رات کو، میں خواب میں، تصویرِ یار
جاگ اُٹھا، جو کھینچنی تصویر آدھی رہ گئی”

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں‘ اے دلنواز!
مستیِ چشمِ سیہ سے چل کے ہوویں چارہ ساز
تو صدائے پا سے جاگا تھا جو، محوِ خوابِ ناز!
“دیکھتے ہی، اے ستمگر! تیری چشمِ نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی”

اُس بُتِ مغرور کو کیا ہو سکی پر التفات!
جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اِک اَدنا ہے بات
ماہِ نَو نکلے پہ گذری ہونگی راتیں پان سات
“اُس رُخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات
تابشِ خورشیدِ پُر تنویر آدھی رہ گئی”

تا مجھے پہنچائے کاہش، بختِ بد ہے گھات میں
ہاں فراوانی اگر کچھ ہے‘ تو ہے آفات میں
جز غم و رنج و اَلم، گھاٹا ہے ہر ایک بات میں
“کم نصیبی اِس کو کہتے ہیں، کہ میرے ہات میں
آتے ہی، خاصیت، اکسیر آدھی رہ گئی”

سب سے یہ گوشہ کنارے ہے، گلے لگ جا مرے
آدمی کو کیوں پکارے ہے، گلے لگ جا مرے
سرے گر چادر اُتارے ہے، گلے لگ جا مرے
”مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے، گلے لگ جا مرے
وصل کی شب، اے بُتِ بے پیر آدھی رہ گئی“

میں یہ کیا جانوں، کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے
پر نصیب اپنا، انہیں جاتا سُنا، جوں پھر گئے
دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
”آگے آدھی دُور میرے گھر سے، وہ کیوں پھر گئے؟
کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی“؟

ناگہاں یاد آ گئی ہے مجھ کو، یارب! کب کی تاب
کچھ نہیں کہتا کسی سے، سُن رہا ہوں سب کی بات
کس لئے تجھ سے چھپاؤں، ہاں وہ پرسوں شب کی بات!
”نامہ بر جلدی میں تیری، وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر، آدھی رہ گئی“

ہو تجلی برق کی صورت میں، ہے یہ بھی غضب
ہاں چھ گھنٹے کی تو ہوتی، فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے، تو کیا اچھی گزرتی رات سب
''پاس میرے وہ جو آئے بھی، تو بعد از نصف شب
نکلی آدھی حسرت، اے تقدیر! آدھی رہ گئی''

تم جو فرماتے ہو، دیکھ، اے غالبؔ آشفتہ سر!
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے، گیا کیوں اُس کے گھر؟
جان کی پاؤں اماں باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
''دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفرؔ
وہاں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی''

قصیدہ

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالیِ ایلن برونِ والا جاہ
بلند رُتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر
کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کُلاہ
وہ محضِ رحمت و رافت، کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پُرسش کی
بنے ہے، شعلۂ آتش، انیسِ پرّۂ کاہ
زمیں سے سُودۂ گوہر اُٹھے، بجائے غبار
جہاں ہو توسنِ حشمت کا اُس کے جولا نگاہ
وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں: "الٰہی، شکر"
وہ خشمگیں ہو، تو گردوں کہے: "خدا کی پناہ"

ق

یہ اُس کے عدل سے، اضداد کو ہے آمیزش
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہ ہر سرِ راہ
ہزبر، پنجے سے، لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے اُلجھی ہوئی دُمِ روباہ
نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسر شاہ
خدا نے اُس کو دیا ایک خوبرو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوے ماہ
زہے، ستارۂ روشن، کہ جو اُسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو، اُس کا تارِ نگاہ
خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنیگا شرق سے تاغرب اِس کا بزیگاہ
جواں ہو کے کرے گا یہ وہ جہانبانی
کہ تابع اس کے ہوں روز و شبِ سپید و سیاہ
کہے گی خلق اِسے "داورِ سپہرِ شکوہ"
لکھیں گے لوگ اِسے "خسروِ ستارہ سپاہ"
عطا کرے گا خداوندِ کارساز اِسے
روانِ روشن و خوے خوش و دلِ آگاہ

ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں، کہ اِسے
پڑے نہ قطعِ خصومت میں، احتیاجِ گواہ
یہ تُرکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس
یہ لے گا، بادشہِ چیں سے، چھین تخت و کُلاہ
سنینِ عیسوی، اٹھارہ سو اور اٹھاون
یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ
یہ جتنے سینکڑے ہیں سب ہزار ہو جاویں
دراز اِس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ
اُمیدوارِ عنایات، "شیوہ نارائن"
کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ
یہ چاہتا ہے کہ دُنیا میں عزّ و جاہ کے ساتھ
تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ!

قصیدہ

گنی ہیں سال کے رشتہ میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ
گرہ کی ہے یہی گنتی، کہ تا بروزِ شمار
ہوا کریگی ہر اِک سال’ پیش کار گرہ
یقین جان، برس گانٹھ کا ہے جو تاگا
یہ کہکشاں ہے’ کہ ہیں اس میں بیشمار گرہ
گرہ سے اور گرہ کی اُمید کیوں نہ پڑے!
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں، تین چار گرہ
دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ ”دیکھ کتنی اُٹھا لائے گا یہ تار گرہ؟“
کہا، کہ ”چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنینگے تو پاوینگے نو ہزار گرہ“
خود آسمان’ ہے مہاراؤ راجا پر صدقے
کرے گا سینکڑوں، اس تار’ پر نثار گرہ
وہ راؤ راجہ بہادر’ کہ حکم سے جن کے
رواں ہو تار پہ فی الفور’ دانہ وار’ گرہ
انہیں کی سالگرہ کے لئے ہے سال بسال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی’ نو بہار گرہ
انہیں کی سالگرہ کے لئے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو’ ابرِ تگرگ باز’ گرہ
انہیں کی سالگرہ کے لئے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں’ ثمر ہائے شاخسار’ گرہ
سُن’ اے ندیم! برس گانٹھ کے یہ تاگے نے
تجھے بتاؤں، کہ کیوں کی ہے’ اختیار گرہ
پےِ دُعائے بقائے جنابِ فیض مآب
لگے گی اس میں ثوابت کی استوار گرہ
ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی
بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ
عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اُس کو
کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زینہار گرہ

کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں، جب اُس زمانے میں
بچے نہ از پئے بندِ نقاب یار، گرہ
متاعِ عیش کا، ہے قافلہ چلا آتا
کہ جادہ رشتہ ہے، اور ہے شتر قطار، گرہ
خدا نے دی ہے وہ غالبؔ کو دستگاہِ سخن
کروڑ ڈھونڈ کے لاتا یہ خاکسار، گرہ
کہاں مجالِ سخن، سانس لے نہیں سکتا
پڑی ہے، دل میں مرے، غم کی پیچدار گرہ
گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات
زباں تک آ کے ہوئی اور اُستوار گرہ
کھلے یہ گانٹھ تو البتہ دم نکل جاوے
بُری طرح سے ہوئی اور اُستوار گرہ
اِدھر نہ ہو گی توجہ حضور کی جب تک
کبھی کسی سے کھلے گی نہ زینہار گرہ
دعا ہے یہ کہ، مخالف کے دل میں، ازرہِ بغض
پڑی ہے، یہ جو بہت سخت نابکار گرہ

دِل اُس کا پھوڑ کے نکلے، بشکل پھوڑے کی
خدا کرے کہ کرے اِس طرح اُبھار گرہ

قصیدہ

کرتا ہے چرخ روز، بصد گونہ احترام   فرماں روائے کشورِ پنجاب کو سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس   نوابِ مستطاب، امیرِ شہ احتشام
جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم   تُرکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حُسام
جس بزم میں کہ ہو اُنہیں، آئینِ میکشی   واں آسمان شیشہ بنے، آفتاب جام
چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چاردہ کہوں   دل نے کہا، کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا   حضرت کا عزّ و جاہ رہے گا علی الدوام
سچ ہے، تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے   دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام
میری سنو، کہ آج تم اِس سرزمین پر   حق کے تفضّلات سے ہو مرجعِ انام
اخبارِ لودھیانہ میں، میری نظر پڑی   تحریر ایک، جس سے ہوا بندہ، تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو، جگر   کاتب کی آستیں ہے، مگر، تیغِ بے نیام
وہ فرد، جس میں نام ہے میرا غلط لکھا   جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ، یک قلم   نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جانگداز   جس نے، جلا کے، راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں   اِستادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
اُس بزمِ پُر فروغ میں، اس تیرہ بخت کو   نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام

سمجھا اُسے گراب، ہوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھ پہ چلی، چشمکِ عوام

عزت پہ، اہل نام کی ہستی کی ہے، بنا
عزت جہاں گئی، تو نہ ہستی رہی، نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اُس ناز کا، فلک نے لیا، مجھ سے، انتقام

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اژدہام

اس کش مکش میں آپ کا مدّاحِ دردمند
آقا سے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

جو واں نہ کہہ سکا تھا، وہ لکھا حضور کو
دیں آپ میری داد، کہ ہوں فائز المرام

ملک و سپہ نہ ہو، تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں
سلطانِ برّ و بحر کے در کا، ہوں میں غلام

وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خوان ہو
شاہانِ عصر چاہیے، لیں عزت اس سے وام

خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
بیوجہ کیوں ذلیل ہو غالبؔ ہے جس کا نام

امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے، سوال
بارے قدیم قاعدے کا، چاہیے قیام

ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے
یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دُعا، کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے
اقلیمِ ہند و ہند سے تا ملکِ روم و شام

قصیدہ

مرحبا! سالِ فرخی آئیں
عیدِ شوال و ماہِ فروردیں
شب و روز، افتخارِ لیل و نہار
مہ و سال، اشرفِ شہور و سنیں
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز
لیک بیش از سہ ہفتہ بُعد نہیں
سو اِس اکیس دن میں، ہولی کی
جابجا مجلسیں ہوئی رنگیں
شہر میں کُوبکُو، عبیر و گُلال
باغ میں سُو بسُو، گُل و نسریں
شہر، گویا، نمونۂ گلزار
باغ، گویا، نگار خانۂ چیں
تین تیوہار، اور ایسے خُوب
جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں
منعقد، محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نواب
رونق افزاے مسندِ تمکیں
بزمگہ میں، امیرِ شاہ نشاں
رزمگہ میں، حریفِ شیر کمیں
پیشگاہِ حضورِ شوکت و جاہ
خیر خواہِ جناب، دولت و دیں
جن کی مسند کا آسماں، گوشہ
جن کی خاتم کا آفتاب، نگیں
جن کی دیوارِ قصر کے نیچے
آسماں ہے گدائے سایہ نشیں
دہر میں اِس طرح کی بزمِ سرور
نہ ہوئی ہو کبھی بروے زمیں
انجمنیں چرخ، گوہر آگیں فرش
نورِ مے، ماہِ ساغرِ سیمیں
راجہ اِندر کا جو اکھاڑا ہے
ہے وہ بالاے سطحِ چرخِ بریں
وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال
یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں
واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم!
کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے ژالہ آسا بچھے ہیں دُرِّ ثمیں
نغمۂ مطربانِ زُہرہ نوا جلوۂ لُولیانِ ماہ جبیں
اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون یاں، وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں
سرورِ مہر فر ہوا جو سوار بکمالِ تجمّل و تزییں
سب نے جانا، کہ ہے پری توسن اور بالِ پری ہے دامن زیں
نقشِ سُمِ سمند سے یکسیر بن گیا دشت، دامنِ گلچیں
فوج کی گردِ راہ، مُشک فشاں رہرووں کے مشام، عطر آگیں
بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
مؤکبِ خاص یوں زمیں پر تھا جس طرح ہے سپہر پر پرویں

ق

چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام ران پر داغِ تازہ دے کے وہیں
اور داغ آپ کی غلامی کا خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں
بندہ پرور! ثنا طرازی ہے مدّعا عرضِ فنِّ شعر نہیں
آپ کی مدح، اور میرا منہ! گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں!
اور پھر اب، کہ ضعفِ پیری سے ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی، خدا کی پناہ! دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف اظہار ہے، ارادت کا ہے قلم کی جو سجدہ ریز زمیں
مدح گستر نہیں، دعا گو ہے غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
ہے دُعا بھی یہی، کہ دنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں! آمیں!

مثنوی

ایک دن، مثلِ پتنگِ کاغذی
لے کے، دل، سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا
اِس قدر بگڑا، کہ سر کھانے لگا
میں کہا: ''اے دل! ہوائے دلبراں
بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں''
''پیچ میں اُن کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں رہیں گے کِسُو کے یارِ غار''
''گورے پنڈے پر، نہ کر، اِن کے نظر
کھینچ لیتی ہیں یہ، ڈورے ڈال کر''
''اب تو مل جائے گی تیری اُن سے سانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ''
''سخت مشکل ہو گا، سلجھانا تجھے
قہر ہے دل، ان میں اُلجھانا، تجھے''
''یہ جو محفل میں، بڑھاتے ہیں تجھے
بھول مت اِس پر، اُڑاتے ہیں تجھے''
''ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں
مُفت میں ناحق کٹا دیں گے تمہیں''
دل نے سُن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب
غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بَرَد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

قطعات

قطعہ

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک!   رہا ہے زور سے، ابر ستارہ بار برس
کہاں ہے ساقیِ مہوش کہاں ہے ابرِ مطیر؟   بیار، لا، مے گلنار گوں؛ بہار برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی   درِ حضور پر، اے ابر! بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو مَلَک، وہ کہے   ”امیرِ کلبِ علی خاں جئیں ہزار برس“
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں   کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات! اِس بلاکش نے   بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شِفا ہو آپ کو، غالبؔ کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے، کہ یہ ایسا ہو ساز گار برس

قطعہ

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آبادِ دکن، رشکِ گلستانِ اِرَم
رام پور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے، اِس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
رام پور، ایک بڑا باغ ہے، از رُوے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرّم
جس طرح باغ میں سانون کی گھٹائیں برسیں
ہے اُسی طور پر، یہاں دجلہ فشاں، دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مُدام

دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبح دم باغ میں آ جائے، جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبّذا باغِ ہمایونِ تقدّس آثار!
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مَسلکِ شرح کئے ہیں راہرو و را شناس
خضر بھی یہاں اگر آجائے، تو لے اِن کے قدم
مدح کے بعد دُعا چاہیے، اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اِغراق رقم
حق سے کیا مانگیے، اُن کے لیے جب ہو موجود
مُلک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و عَلَم
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غُلو کے قائل
دو دُعائیں ہیں، کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا! غالبؔ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں، کہ طلبگار ہے جن کا عالم
اوّلاً عمرِ طبیعی، بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

قطعۂ تاریخِ اختتامِ کتاب

سلیم خاں، کہ وہ ہے نورِ چشم واصل خاں   حکیم حاذق و دانا ہے، وہ لطیف کلام
تمام دہر میں اس کے مطلب کا چرچا ہے   کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اُسے فضائلِ علم و ہنر کی افزائش   ہوئی ہے مبدءِ عالم سے، اس قدر انعام
کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اس کے   ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخۂ نادر، لکھا ہے اک اس نے   کہ جس میں حکمتِ طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب، ہے اِک منبعِ نکاتِ بدیع   نہیں کتاب، ہے اک معدنِ جواہر کام
کل اِس کتاب کے سالِ تمام میں، جو مجھے   کمالِ فکر میں دیکھا، خرد نے بے آرام
کہا یہ جلد، کہ تو اِس میں سوچتا کیا ہے
"لکھا ہے نسخۂ تحفہ" یہی ہے سالِ تمام

◆

اے جہان آفریں، خدائے کریم!   صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم
نام میکلوڈ جن کا ہے مشہور   یہ ہمیشہ بصد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شادمان رہیں
اور غالبؔ پہ مہربان رہیں

قطعہ

گوڑگانویں کی ہے جتنی رعیّت، وہ یک قلم — عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی
سو یہ نظر فروز قلمدان نذر ہے — مسٹر کووان صاحبِ عالی مقام کی

سہرا

خوش ہو، اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ، شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ کلاہ!
مجھ کو ڈر ہے، کہ نہ چھینے تیرا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اِک بے ادبی تھی، کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی، کہ ہمیں ہیں اِک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرّر، سہرا
جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر، سہرا!
رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر، سہرا
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر، سہرا
ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرف دار نہیں
دیکھیں، اِس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

سہرا

ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں
بزمِ شادی ہے فلک، کاہکشاں ہے سہرا
اِن کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں، ولے بحرِ رواں ہے سہرا

سہرا

چرخ تک دُھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا
چاند کا دائرہ لے، زُہرہ نے گایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں، آپس میں اُلجھ کر لڑیاں
باندھنے کے لئے جب سَر پہ اُٹھایا سہرا

قطعۂ تاریخ

اِس کتاب طرب نصاب نے' جب   آب و تاب انطباع کی پائی
فکرِ تاریخ سال میں، مجھ کو   ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو   دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا   با ہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم   بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو   ہے جداگانہ کار فرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ   بہ اُمیدِ سعادت افزائی
غرض اِس سے ہیں چاردہ معصوم   جس سے ہے چشمِ جاں کو زیبائی
اور بارہ امام ہیں بارہ   جس سے ایمان کو ہے توانائی
اُن کو غالبؔ یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں تولاّئی

خط منظوم بنام علائی

بس کہ فَعّالِ مَا یُرِیْد ہے آج   ہر سِلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زَہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے   گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک   تشنۂ خوں ہے، ہر مُسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک   آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا، کہ مل گئے، پھر کیا؟   وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ   سوزشِ داغہاے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم   ماجرا دیدہاے گِریاں کا
اِس طرح کے وصال سے، یارب!
کیا مٹے داغ و دل سے ہجراں کا

خط منظوم بنام علائی

خوشی ہے یہ، آنے کی برسات کے   پییں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم   کہ دلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مطلوبِ جاں   نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باور چیوں کو، کہ ہاں!   ابھی جا کے پوچھو، کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹّے کہاں پائیں املی کی پھول   وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو، اس کو کیا، کھا کے ہم خط اٹھائیں

قطعہ

اے منشیِ خیرہ سر! سخن ساز نہ ہو — عصفور ہے تو، مقابلِ باز نہ ہو
آواز تری نکلی، اور آواز کے ساتھ — لاٹھی وہ لگی، کہ جس میں آواز نہ ہو

قطعہ

کیا، اِن دنوں بسر ہو، ہماری فراغ میں — کچھ تفرقہ رہا، نہ دل و درد و داغ میں
چاہا بچشمِ شوق، جو موسیٰ نے طور پر — یہاں دیکھتے ہیں روز وہی، ہر چراغ میں
یہ مکنت و وقار، علائی! یہ حشمتیں
شورش ہے کچھ ضرور، تمہارے دماغ میں

مرثیہ

ہاں، اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو — اے دِجلۂ خوں! چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ معصوم! کہاں ہو
بگڑی ہے بہت، بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی
تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو — گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگۂ نُہ جو مدّت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رُتبہ میں سوا ہے!

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا

کیسا فلک اور مہرِ جہانتاب کہاں کا!
ہو گا دِل بیتاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں، اس رُو سے کہو برق نہیں ہے

سلام

سلام اُسے، کہ اگر بادشا کہیں اُس کو
تو پھر کہیں، کہ پھر اس سے سوا کہیں اُس کو

نہ بادشاہ نہ سُلطاں، یہ کیا ستایش ہے
کہو، کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اُس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟
کہو، کہ رہبر راہِ خدا کہیں اُس کو

خدا کا بندہ، خداوند گار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اُس کو؟

فروغِ جوہرِ اماں، حسینؓ ابنِ علیؓ
کہ شمع انجمنِ کبریا کہیں اُس کو

کفیلِ بخششِ اُمت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اُس کو

مسیح جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اُس کو

وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہیدِ تشنہ لب کربلا کہیں اُس کو

عدو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جن و انس و ملک سب بجا کہیں اُس کو

بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؓ بلند
بقدرِ فہم ہے، گر کیمیا کہیں اُس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرۂ خاک
کہ نوک جوہر تیغ قضا کہیں اُس کو

ہمارے درد کی، یارب! کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اُس کو

ہمارا منہ ہے، کہ دیں اُس کے حُسنِ صبر کو داد!
مگر نبیؐ و علیؓ مرحبا کہیں اُس کو

زمامِ ناقہ کف اُس کے میں ہے، کہ اہلِ یقیں
پس از حسینؓ علیؓ پیشوا کہیں اُس کو
وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خُدا رہنما کہیں اُس کو
امامِ وقت کی یہ قدر ہے، کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اُس کو
یہ اجتہاد عجب ہے، کہ ایک دشمنِ دیں
علیؓ سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اُس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
بُرا نہ مانیے، گر ہم بُرا کہیں اُس کو
علیؓ کے بعد حَسنؓ کے بعد حسینؓ
کرے جو اُن سے بُرائی، بھلا کہیں اُس کو؟
نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے
رکھے امام سے جو بُغض، کیا کہیں اُس کو
بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے، کہ خونیں نوا کہیں اُس کو

رباعیات

رُقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقبؔ! حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بیوجہ جواب
غالبؔ کا پکا دیا کلیجا تم نے

◆

اے روشنیِ دیدۂ شہاب الدین خاں!
کٹتا ہے بتاؤ، کس طرح سے رمضاں؟
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟
سُنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟

◆

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیونکر ہو، ماوراء النہری؟

فردیات

مے کشی کو نہ سمجھ لے حاصل
بادہ، غالبؔ! عرقِ بید نہیں

○

ابر روتا ہے، کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے، کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

○

بہا ہے یاں تک اشکوں میں، غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں، ہر اِک پارۂ دل، پائے درگل ہے

○

دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ، سو آپ کا
دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال کے

○

شمشیرِ صاف یار، جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِّ سبز ہے، کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

○

دیکھتا ہوں اسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں' ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

○

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے، چمن زعفراں مجھے

○

جگر سے ٹوٹے ہوئے سُوکی ہے سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

○

نیازِ عشق، خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق، مشتِ خار و خس بہتر

○

یاد آیا جو وہ کہنا کہ "نہیں" واہ! غلط
کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

○

ماہِ نو ہوں' کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

○

صبا! لگا وہ طپانچے طرف سے بُلبل کی
کہ رُوئے غنچۂ گُل سوئے آشیاں پھر جائے

* * *

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے، کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رُلایا ہے، کہ جی جانے ہے

* * *

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا!
مذہب نہیں ہے کوئی، ملّت نہیں ہے کوئی

* * *

گُلشنِ دہر بھی، ہے کوئی سرائے ماتم
شبنم اس باغ میں جب آئے، تو گریاں آئے

* * *

دو رنگیاں یہ زمانے کی، جیتے جی ہیں سب
کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

* * *

پھر مرتبہ بڑھایا مرا، نفیِ غیر نے
آیا ہر ایک مکاں نظر، لامکاں مجھے

* * *

پیری میں بھی کمی نہ ہوئی جھانک تانک کی
روزن کی طرح، دید کا آزار رہ گیا
وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر
آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

* * *

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

نسخۂ حمیدیہ

○

تنگیِ رفیقِ رہ تھی، عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر
کس کو دماغِ منّتِ گُفت و شنود تھا
خُور شبنم آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسدؔ!
سر تا قدم، گزارشِ ذوقِ سجود تھا

○

ہے کہاں، تمنّا کا دوسرا قدم، یا رب!
ہم نے دشتِ امکاں کو، ایک نقشِ پا، پایا
بے دماغِ خجلت ہوں، رشکِ امتحاں تا کے
ایک بیکسی، تجھ کو عالم آشنا پایا
خاکبازیِ اُمید، کار خانہ طفلی
یاس کو دو عالم سے، لب بخندہ وا پایا

○

شب، نظارہ پرور تھا، خواب میں خیال اُس کا
صُبح، موجۂ گُل کو نقشِ بوریا پایا

○

کارخانہ سے، جنوں کے بھی، میں عریاں نکلا
میری قسمت کا، نہ ایک آدھ گریباں نکلا
ساغرِ جلوۂ سرشار، ہے ہر ذرّۂ خاک
شوقِ دیدار، بلا آئینہ ساماں نکلا
کچھ کھٹکتا تھا مرے سینہ میں، لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا
وسعتِ رحمتِ حق دیکھ، کہ بخشا جاوے
مجھ سا کافر، کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

○

دیدہ تا دل ہے، یک آئینہ چراغاں، کس نے خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا؟
مطربِ دل نے، مرے تارِ نفس سے غالبؔ! ساز پر رشتہ پےِ نغمۂ بیدلؔ باندھا

○

واں، ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ! ناخنِ غم، یاں، سرِ تارِ نفس مضراب تھا

○

اگر آسودگی، ہے مدّعائے رنجِ بیتابی نثارِ گردشِ پیمانۂ مے، روزگار اپنا

○

ہوائے صبح یک عالم گریباں چاکیِ گُل ہے دہانِ زخم پیدا کر، اگر کھاتا ہے غم میرا

○

اسدؔ! یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے جسے تو بندگی کہتا ہے، دعویٰ ہے خدائی کا

○

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں سمجھا

○

نگاہِ چشمِ حاسد وام لے، اے ذوقِ خود بینی!   تماشائی ہوں، وحدت خانۂ آئینۂ دل کا
شرر فرصت نگہ، سامانِ یک عالم چراغاں ہے   بقدرِ رنگ، یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا
سراسر تاختن کو، شش جہت یک عرصہ جولاں تھا   ہوا واماندگی سے رہرواں کی فرق منزل کا

مجھے راہِ سخن میں، خوفِ گمراہی، نہیں، غالبؔ!
عصائے خضرِ صحرائے سخن، ہے خامہ بیدلؔ کا

○

بصورت تکلف، بمعنی تأسف   اسدؔ! میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

○

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش، در بھی دُور تھا   اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا
اے وائے! غفلتِ نگہ، شوق، ورنہ یاں   ہر پارہ سنگ، لختِ دل کوہِ طور تھا
درسِ تپش ہے، برق کو اب اُس کے نام سے   وہ دل ہے یہ، کہ جس کا تخلص صبورؔ تھا
جنت ہے، تیری تیغ کے کشتوں کی، منتظر   جوہر سوادِ جلوۂ مژگانِ حور تھا

ہر رنگ میں جلا، اسدِؔ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

◆

خود پرستی سے رہے باہم دگر، نا آشنا
بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا
آتش موے دماغِ شوق‘ ہے تیرا تپاک
ورنہ ہم کس کے ہیں‘ اے داغِ تمنّا! آشنا
بیدماغی شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہیں
یار تیرا جامِ مے‘ خمیازہ میرا آشنا
ربطِ یک شیرازۂ وحشت‘ ہیں اجزاے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارۂ گل نا آشنا

◆

اندازِ نالہ‘ یاد ہیں سب مجھ کو، پر اسدؔ!
جس دل پہ ناز تھا مجھے‘ وہ دل نہیں رہا

◆

بُت پرستی‘ ہے بہارِ نقش بندی ہاے دہر
ہر صریرِ خامہ میں یک نالۂ ناقوس تھا
کل اسدؔ کو ہم نے دیکھا، گوشۂ غم خانہ میں
دست بر سر، سر بہ زانوے دلِ مایوس تھا

◆

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا، ورنہ
اشارت فہم کو، ہر ناخنِ بُریدہ، ابرو تھا

◆

بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیح کوکب ہا

کرے گر، فکرِ تعمیر خرابی ہاے دل، گردوں
نہ نکلے خشت مثلِ استخواں، بیرونِ قالب ہا

کرے ہے، حُسنِ خوباں، پردہ میں مشاطگی اپنی
کہ ہے تہ بندیِ خط، سبزۂ خط در تہِ لب ہا

اسدؔ کو بُت پرستی سے غرض دردِ آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ ”یارب ہا“

◆

بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شہرت، اہتمام اُس کا
نگیں میں، جوں شرارِ سنگ، ناپیدا ہے نام اُس کا
بہ اُمیدِ نگاہِ خاص ہوں، محمل کشِ حسرت
مبادا ہو عناں گیرِ تغافل، لطفِ عام اُس کا
اسدؔ! سوداے سرسبزی سے، ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اُس کا، ابرِ بے پروا خرام اُس کا

○

عشق میں، ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا   ورنہ، جو چاہیے اسبابِ تمنّا، سب تھا
آخر کار گرفتارِ سَرِ زلف ہوا   دل دیوانہ، کہ وارستۂ ہر مذہب تھا
شوق سامانِ فضولی ہے، وگرنہ، غالبؔ!
ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنّا کب تھا

○

یک گامِ بے خودی سے لوٹیں بہارِ صحرا   آغوشِ نقشِ پا میں کیجیے فشارِ صحرا
وحشت اگر رسا ہے، بیحاصلی ادا ہے   پیمانہ ہوا ہے، مُشتِ غُبارِ صحرا
دیوانگی اسدؔ کی، حسرت کشِ طرب ہے
در سَر ہوائے گلشن، در دل غبارِ صحرا

○

وحشی بن، صیّاد نے ہم رمخوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ، صرفِ قماشِ دام کیا
مہر بجائے نامہ لگائی، بر لبِ پیکِ نامہ رساں
قاتل تمکیں سنج نے، یوں خاموشی کا پیغام کیا
شامِ فراقِ یار میں، جوشِ خیرہ سری سے ہم نے، اسدؔ!
ماہ کو، در تسبیحِ کواکب، جائے نشینِ امام کیا

○

سیرِ آنسوے‘ تماشا ہے طلبگاروں کا   خضر‘ مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا
پھر وہ سُوے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے!   رنگ اڑتا ہے‘ گلستاں کے ہوا داروں کا

اسد، اے ہرزہ درا! نالہ بہ غوغا تاچند؟
حوصلہ تنگ نہ کر، بے سبب آزاروں کا

○

بوقتِ کعبہ جوئی ہا، جرس کرتا ہے ناقوسی
کہ صحرا، فصلِ گُل میں، رشک ہے بُت خانۂ چیں کا
اسدا! اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

○

وِردِ اسمِ حق سے، دیدارِ صنم حاصل ہوا   رشتۂ تسبیح‘ تارِ جادۂ منزل ہوا
عیب کا دریافت کرنا‘ ہے ہنرمندی اسدا!   نقص پر اپنے ہوا جو مطّلع، کامل ہوا

○

سرِ منزلِ ہستی سے ہے صحرائے طلب دور   جو خط ہے کفِ پا پہ‘ سو ہے سلسلۂ پا

○

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ رفتار نہیں، بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے؟ اے عجزِ تمنا! سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ
آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
”عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ“

○

زندگانی نہیں بیش از نفسِ چند اسد!
غفلت آرامیِ یاراں پہ ہیں خنداں، گل و صبح

○

تھی، نگہ میری، نہانخانۂ دل کی نقاب   بے خبر جیتے ہیں اربابِ ریا، میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ   مُتفرّق ہوئے میرے رفقا، میرے بعد

○

ہم نے سو زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گُل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد
تیغ درکف، کف بلب، آتا ہے قاتل اس طرف
مُژدہ باد، اے آرزوے مرگِ غالبؔ! مژدہ باد

○

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند   اے طفلِ خود معاملہ! قد سے عصا بلند
رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حُسنِ دوست   مژگانِ باز ماندہ سے، دستِ دعا بلند
قربانِ اوج ریزیِ چشمِ حیا پرست   یک آسماں ہے، مرتبۂ پشتِ پا بلند
ہے، دلبری، کمیں گرِ ایجادِ یک نگاہ   کارِ بہانہ جوئیِ چشمِ حیا بلند

○

چشمِ بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ　　بزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گُل تا چند
بزم، داغِ طرب و باغِ کشادِ پرِ رنگ　　شمع و گُل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند
سادگی ہے، عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا　　ناکسی! آئینۂ نازِ توکل تا چند
اسدِ خستہ، گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کن یک خلق! تغافل تا چند

○

نوازشِ نفَسِ آشنا کہاں، ورنہ　　برنگِ نَے ہے نہاں، در ہر استخواں فریاد
تغافل آئینہ دارِ خموشیِ دل ہے　　ہوئی ہے محو، بہ تقریبِ امتحاں فریاد
ہلاکِ بیخبری، نغمۂ وجود و عدم　　جہان و اہلِ جہاں سے، جہاں جہاں فریاد
جواب سنگدلی ہاے دشمناں، ہمت　　زدستِ شیشۂ دلہاے دوستاں فریاد
ہزار آفت و یک جانِ بے نواے اسد
خدا کے واسطے، اے شاہِ بیکساں! فریاد

○

رگِ گُل جادۂ تا رِنگہ سے حد موافق ہے
ملیں گے منزلِ اُلفت میں ہم اور عندلیب آخر
غرورِ ضبط، وقتِ نزع ٹوٹا بیقراری ہے
نیازِ بال افشانی ہوا صبر وشکیب آخر
اسؔد کی طرح، میری بھی، بغیر از صبح رخساراں
ہوئی شامِ جوانی، اے دلِ حسرت نصیب! آخر

○

ظلم کرنا، گدائے عاشق پر نہیں شاہانِ حُسن کا دستور
دوستو! مجھ ستم رسیدہ سے دشمنی ہے، وصال کا مذکور
زندگانی پہ اعتماد، غلط ہے کہاں قیصر؟ اور کہاں فغفور؟
کیجئے جُوں اشک، اور قطرہ زنی
اے اسؔد! ہے ہنوز دِلّی دُور

○

اے چرخ! خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات لیکن بنائے عہدِ وفا، استوار تر

○

تیز تر ہوتا ہے خشمِ تند خویاں عجز ہے
ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغِ شعلۂ خار و خس
سختیِ راہِ محبت، منعِ دخلِ غیر ہے
پیچ و تابِ جادۂ ہے یاں جوہرِ تیغِ عَسَس
اے اسدؔ! خود ہم اسیر رنگ و بوے باغ ہیں
ظاہراً صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

○

کفر ہے، غیر از وفورِ شوق، رہبر خواستن
راہِ صحرائے حرم میں، ہے جرس، ناقوس و بس
یک جہاں گل، تختۂ مشقِ شگفتن ہے، اسدؔ!
غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

○

اے آرزو شہیدِ وفا! خونبہا نہ مانگ جز بہر دست و بازوے قاتل دعا نہ مانگ
برہم ہے بزمِ غنچہ، بہ یک جنبشِ نشاط کاشانہ بسکہ تنگ ہے، غافل! ہوا نہ مانگ
میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں دشمن سمجھ، ولے نگہ آشنا نہ مانگ
نظارہ دیگر و دلِ خونیں نفس دگر آئینہ دیکھ، جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ

○

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے   وگر نہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم
بہار، در گروِ غنچۂ شہر جولاں ہے   طلسمِ ناز، بجز تنگیِ قبا معلوم
طلسمِ خاک، کمیں گاہِ یک جہاں سودا   بمرگ، تکیۂ آسائشِ فنا معلوم
اسدؔ، فریقتۂ انتخابِ طرزِ جفا
وگر نہ دلبریِ وعدہِ وفا معلوم

○

فرطِ بیخوابی سے ہیں شبہائے ہجرِ یار میں   جوں زبانِ شمع، داغِ گرمیِ افسانہ ہم
جانتے ہیں، جوششِ سودائے زلفِ یار میں   سنبلِ بالیدہ کو موئے سرِ دیوانہ ہم
بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے   چپکے چپکے جلتے ہیں، جوں شمعِ ماتم خانہ ہم

○

از آنجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم   رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم
تماشائے گلشن، تمنائے چیدن   بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
نہ ذوقِ گریباں، نہ پروائے داماں   نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسدؔ! شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

○

غالبؔ! ہے رُتبہ فہم تصور سے کچھ پرے
ہے عجزِ بندگی، جو علیؑ کو خدا کہوں

○

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا؟ غالبؔ!
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

○

جائے کہ پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں
دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں

○

ناگوارا ہے ہمیں احسان صاحب دولتاں
ہے زرِ گل بھی' نظر میں جوہرِ فولاد، یاں
قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں' اسدؔ!
ہے تماشا کردنی، گل چینیِ جلاد، یاں

○

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن
قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
وقت ہے، گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے
یوسفِ گل جلوہ فرما ہے، بہ بازارِ چمن

* * *

پھر حلقۂ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں
جُوں دُود فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں
پایا سرِ ہر ذرّہ، جگر گوشۂ وحشت
ہیں داغ سے معمُور، شقائق کی کلاہیں
دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

* * *

تمیزِ زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں
بہ عکسِ آئینہ یک فردِ سادہ رکھتے ہیں
بہ زاہداں رگِ گردن، ہے رشتۂ زنّار
سرے بپاے بُتے نا نہادہ رکھتے ہیں

* * *

سوداے عشق سے، دمِ سردِ کشیدہ ہوں
شامِ خیالِ زُلف سے، صبحِ دمیدہ ہوں
دورانِ سر سے گردشِ ساغر ہے متّصل
خمخانۂ جنوں میں دماغِ رسیدہ ہوں
کی متصل ستارہ شماری میں عمر صرف
تسبیح اشکہاے زمژگاں چکیدہ ہوں
ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
جوں شانہ، پُشتِ دست بدنداں گزیدہ ہوں
ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں
دیتا ہوں کشتگاں کو، سخن سے سرِ تپش
مضرابِ تا رہاے گلوے بریدہ ہوں
ہے جنبشِ زباں بدہن، سخت ناگوار
خونابۂ بلاہل حسرت چشیدہ ہوں
جوں بوے گل، ہوں گرچہ، گراں بارِ مشتِ زر
لیکن، اسدؔ! بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں

○

نہ انشا معنیِ مضموں، نہ اِملا صورتِ موزوں
عنایت نامہاے اہلِ دنیا ہر زہ عنواں ہیں
مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے
وگرنہ، مثلِ خارِ خشک، مردودِ گلستاں ہیں
اسدؔ! بزمِ تماشا میں، تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ عریاں ہیں

○

اے نوا سازِ تماشا! سربکف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل، اور اِک طرف جلتا ہوں میں
ہے تماشا گاہ سوزِ تازہ، ہر یک عضوِ تن
جوں چراغانِ دِوالی صف بصف جلتا ہوں میں
شمع ہوں، تو بزم میں جاپاؤں غالبؔ کی طرح
بے محل، اے مجلس آراے نجف! جلتا ہوں میں

○

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں برنگِ جادہ، سرِ کوے یار رکھتے ہیں
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے، غالبؔ! بسانِ دشت دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

○

ہو سکے کب، گلفتِ دل، مانعِ طوفانِ اشک!
گردِ ساحل، سنگِ راہِ جوششِ دریا نہیں
ہے طلسمِ دَہر میں، صد حشرِ پاداشِ عمل
آگہی، غافل! کہ یک امروز بے فردا نہیں
بسملؔ اس تیغِ دو دستی کا نہ ہے بچّا، اسدؔ!
عافیت بیزار! شغلِ کعبتین اچھا نہیں

○

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
کب تلک پھرے اسدؔ لبہائے تفتہ پر زباں
طاقتِ لب تشنگی، اے ساقیِ کوثر نہیں

○

زلفِ خیال نازک و اظہار بیقرار ۔ یارب! بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

○

ہم زانوے تامل و ہم جلوہ گاہِ گل   آئینہ بندِ خلوت و محفل ہے آئینہ
دل کارگاہِ فکر و اسدؔ بینوائے دل   یاں سنگِ آستانۂ بیدلؔ ہے آئینہ

○

ہر داغِ تازہ، یک دلِ داغ انتظار ہے   عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل   ”دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ“

ل کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے، کہ آہ

○

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ   ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گرداندہ
میکدے میں زدل افسردگیِ بادہ کشاں   موجِ مے، مثلِ خطِ جام، ہے برجا ماندہ
خواہشِ دل ہے زباں کو سبب گفتہ و بیاں   کہ سخن، گرد زدامانِ ضمیر افشاندہ
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے   ہے ہر اِک فردِ جہاں میں ورقِ ناخواندہ
حیف بیحاصلیِ اہلِ ریا پر، غالبؔ!
یعنی ہیں ماندہ ز آں سُوؔ، ازیں سو راندہ

○

کی ہے وا اہلِ جہاں نے بگلستانِ جہاں   چشمِ غفلت نظرِ شبنمِ خُور نادیدہ،
یاس، آئینۂ پیدائیِ استغنا ہے   نااُمیدی، ہے پرستارِ دلِ رنجیدہ
واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے، غالبؔ!
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

* * *

شکوہ و شکر کو ثمر، بیم و اُمید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ، بلا سمجھ
وحشتِ دردِ بیکسی، بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ
گاہ بخُلد امید وار، گہ بہ جحیم بیمناک
گرچہ خدا کی یاد ہے، گُلفتِ ما سوا پچھ
اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ

* * *

گُلفتِ ربطِ این و آں، غفلتِ مُدّعا سمجھ
شوق کرے جو سر گراں، محملِ خوابِ پا سمجھ
جلوہ نہیں ہے دردِ سر، آئینہ صندلی نہ کر
عکس کُجا و کُو نظر، نقش کو مُدّعا سمجھ
ہے خطِ عجزِ ما و تو، اوّلِ درسِ آرزو
ہے یہ سیاقِ گفتگو، کچھ نہ سمجھ، فنا سمجھ
شیشہ شکستِ اعتبار، رنگ بگردش استوار
گر نہ مِٹیں یہ کوہسار، آپ کو تو صدا سمجھ
نغمہ ہے محوِ سازِ رہ، نشہ ہے بے نیازِ رہ
رند تمام نازِ رہ، خلق کو پارسا سمجھ
نے سر و برگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق تو، ہم کو بھی آشنا سمجھ
لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمۂ، یا علیؑ! مدد
ٹوٹے گر آئینہ اسدؔ! سُبحہ کو خوں بہا سمجھ

* * *

ہستی فریبِ نامۂ موجِ سراب ہے
یک عمر نازِ شوخیِ عنواں اُٹھائیے

○

کیا پوچھے ہے برخرد غلطی ہائے عزیزاں خواری کو بھی اک عار ہے، عالی نسبوں سے
گو تم کو رضا جوئیِ اغیار ہے، لیکن جانتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے!
مت پوچھ اسد! وعدۂ کم فرصتیِ زیست
دو دن بھی جو کاٹے، تو قیامت بعتوں سے

○

مجھے معلوم ہے، جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد، اے گردشِ گردونِ دُوں! وہ بھی

○

کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بیوفائی!
سر پیٹتے ہیں اپنا؟ ہم اور نیک نامی
ہر چند عمر گذری آزردگی ہیں، لیکن
ہے شرحِ شوق کو بھی، جوں شکوہ ناتمامی
ہے یاس میں اسد کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گذرے مستوں کی تشنہ کامی

○

گر مصیبت تھی، تو غربت میں اُٹھا لیتے اسد!
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے

○

کیا غم ہے اُس کو جس کا علیؑ سا امام ہو اتنا بھی اے فلک زدہ! کیوں بے حواس ہے؟

○

نظر بہ نقصِ گدایاں، کمالِ بے ادبی ہے کہ خارِ خشک کو بھی دعوائے چمن نسبی ہے
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ لبِ قدح پہ کفِ بادہ، جوشِ تشنہ لبی ہے
خوشادہ دل! کہ سراپا طلسمِ بیخبری ہو جنون و یاس و الم، رزقِ مدّعا طلبی ہے
چمن میں کس کی یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا؟ کہ برگ برگِ سَمَن، شیشہ ریزۂ جلی ہے
امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی علیؑ ولیؑ اسد اللہ، جانشینِ نبی ہے

○

بے چشمِ دل، نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار یعنی، یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

○

تاچند پست فطرتیِ طبعِ آرزو؟ یارب! ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے
یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے اے جوشِ عشق! بادۂ مرد آزما مجھے

○

کہوں کیا گرم جوشی میکشی میں شعلہ رُویاں کی!
کہ شمعِ خانۂ دل آتشِ مے سے فروزاں کی
مجھے اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری تھی
ولیکن کیا کروں، آوے جو رُسوائی گریباں کی

○

وہ دیکھ کے حُسن اپنا، مغرور ہوا غالبؔ!
صد جلوۂ آئینہ یک صُبحِ جدائی ہے

○

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدؔ!
لائق نہیں رہے ہیں، غمِ روزگار کے

○

اسدؔ! جمعیتِ دل در کنارِ بیخودی خوشتر
دو عالم آگہی، سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

○

عاشق نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیے
فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہیے
ساقی! بہارِ موسمِ گُل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے

○

وقت اس افتادہ کا خوش، جو قناعت سے اسدؔ!
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے

○

ہوا شرم تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر
بس اے زخمِ جگر! اب دیکھ لی شورش نمکداں کی
بیادِ گرمیِ صحبت، برنگِ شعلہ، دہکے ہے
چھپاؤں کیونکہ، غالبؔ! سوزشیں داغِ نمایاں کی

○

باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے کر دیا ہے پا بہ زنجیرِ رمِ آہو، مجھے

○

عروجِ نشہ ہے سر تا قدم، قدِ چمن رُویاں
بجائے خود، وگرنہ، سرد بھی مینائے خالی ہے
سیہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے
زمیں، جوشِ طرب سے جامِ لبریزِ سفالی ہے
اسدؔ! اُٹھنا قیامت قامتوں کا، وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں، بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

◆

ہو جہاں، تیرا دماغِ ناز، مستِ بیخودی
خوابِ نازِ گل رُخاں، دُودِ چراغِ کشتہ ہے

◆

آتش افروزیِ یک شعلۂ ایما تجھ سے
چشمک آرائیِ صد شہرِ چراغاں مجھ سے
اے اسدؔ! دسترسِ وصلِ تمنا معلوم
کاش، ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

◆

بسکہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر
گردِ صحرائے حرم تا کوچۂ زنّار ہے
اے سرِ شوریدہ! نازِ عشق و پاسِ آبرو
یک طرف سودا و یک سو منتِ دستار ہے!

◆

بہ سختی ہائے قیدِ زندگی، معلوم آزادی
شرر در بندِ دامِ رشتۂ رگہائے خارا ہے

◆

بذوقِ شوخیِ اعضا تکلفِ بارِ بستر ہے
مصافِ پیچ و تابِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مژہ فرشِ رہ و دل ناتوان و آرزو مضطر
بپائے خفتہ، سیرِ وادیِ پُرخار بستر ہے

◆

ہو سکے کیا خاک، دست و بازوے فرہاد سے
بیستوں، خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے

◆

ترجبیں رکھتی ہے، شرمِ قطرہ سامانی مجھے   موجِ گردابِ حیا ہے، چینِ پیشانی مجھے
شوق ہے مثلِ حباب از خویش بیروں آمدن   ہے گریباں گیرِ فرصت ذوقِ عریانی مجھے

◆

شومیِ طالع سے، ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر   نامۂ اعمال ہے، تاریکیِ کوکب مجھے
دردِ ناپیدا و بے جا تہمتِ وارستگی   پردہ دارِ یاوگی ہے وسعتِ مشرب مجھے

◆

اسدؔ! بہارِ تماشاے گلستانِ حیات   وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

◆

غم و عشرت قدم بوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے
دعاے مدّعا گم کردگانِ عشق "آمیں" ہے
پیامِ تعزیت پیدا ہے، اندازِ عیادت سے
شبِ ماتم، تہِ دامانِ دودِ شمعِ بالیں ہے

○

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم، اسدؔ! دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ سے

○

عبرت طلب ہے، حلِّ معمائے آگہی شبنم گدازِ آئینۂ اعتبار ہے
خلجت کش وفا کو، شکایت نہ چاہیے اے مدّعی! طلسمِ عرق بے غبار ہے

○

کیا ہے ترکِ دنیا، کاہلی سے ہمیں حاصل نہیں، بے حاصلی سے
پَر افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں رہے ہم داغ، اپنی کاہلی سے
خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر پھر ہم دربدر، ناقابلی سے

○

جنوں افسردہ و باں ناتواں، اے جلوہ! شوخی کر-
گئی یک عمرِ خودداری، بہ استقبالِ رعنائی
نگاہِ عبرت افسوں، گاہ برق و گاہ مشعل ہے
ہوا ہر خلوت و جلوت سے حاصل، ذوقِ تنہائی

○

رشک ہے، آسایشِ اربابِ غفلت پر، اسدؔ
پیچ و تابِ دل، نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

○

نے حسرتِ تسلّی، نہ ذوقِ بیقراری
یک درد و صد دوا ہے، یک دست و صد دعا ہے
بُتخانے میں اسدؔ بھی بندہ تھا، گاہ گاہے
حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

○

خانمانِ جبریانِ غفلت معنی خراب
جب ہوئے ہم بے گناہ، رحمت کی کیا تقصیر ہے؟
چاہیے گر جنّت، جُز آدم وارثِ آدم نہیں
شوخیِ ایمانِ زاہد، سُستیِ تدبیر ہے
آب ہو جاتے ہیں، ننگِ ہمّتِ باطل سے، مرد
اشک پیدا کر، اسدؔ! گر آہ بے تاثیر ہے

○

یقیں ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو
دمِ تیغِ توکّل سے اگر پائے سبب کاٹے

○

خبر نگہ کو نگہ، چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر، کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو
زیادہ اُس سے گرفتار ہوں، کہ تو جانے
زباں سے عرض تمنّاے خامشی معلوم
مگر وہ خانہ برانداز "گفتگو" جانے

○

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو، غالبؔ! تو پھر
کیوں نہ دلّی میں، ہر اک ناچیز نوابی کرے

○

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلاں! آغازِ کار، آئینۂ انجام ہے

○

اے خوشا وقتے! کہ ساقیؔ یک خُمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل، پنبۂ مینا کرے
توڑ بیٹھے، جب کہ ہم جام و سبُو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام، گو برسا کرے

◆

بہ رہنِ ضبط ہے، آئینہ بندیِ گوہر
وگر نہ بحر میں ہر قرہ چشمِ پُرنم ہے
اگر نہ ہووے رگِ خواب صرفِ شیرازہ
تمام دفترِ ربطِ مزاج، برہم ہے
اسدؔ! بہ ناز کی طبعِ آرزو، انصاف
کہ ایک وہم ضعیف و غمِ دو عالم ہے

◆

کشودِ غنچۂ دلہا عجب نہ رکھ، غافل!
صبا خرامیِ خوباں، بہار ساماں ہے
اسدؔ! جہاں کہ علیؑ برسرِ نوازش ہو
کشادِ عقدۂ دشوار، کارِ آساں ہے

◆

دامگاہِ عجز میں سامانِ آسایش کہاں!
پَر فشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے
اے ہوس! عرضِ بساطِ نازِ مُشتاقی نہ مانگ
جُوں پرِ طاؤس، چندیں داغ، مُشک اندودہ ہے
کیاں کہوں پرواز کی آوارگی کی کشمکش!
عافیت، سرمایۂ بال و پرِ نکشودہ ہے
جس طرف سے آئے ہیں، آخر اُدھر ہی جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم پیمودہ ہے
پنبۂ مینائی ہی رکھ لو تم اپنے کان میں
مے پرستاں! ناصح بیصرفہ گو، بیہودہ ہے

* * *

کچھ نہیں حاصل تعلق میں، بغیر از کشمکش
اے خوشا رندے! کہ مرغِ گلشنِ تجرید ہے
کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسدؔ
یا علیؓ! وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

* * *

شمع آسا، چہ سرِ دعویٰ و کو پائے ثبات؟
گُل صد شعلہ، بیک جیبِ شکیبائی ہے
بوئے گُل، فتنۂ بیدار و چمن، جامۂ خواب
وصل بر رنگِ تپش، کسوتِ رسوائی ہے

* * *

نوائے خفتۂ اُلفت اگر بیتاب ہو جاوے
پرِ پروانہ، تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے
بہ رنگِ گُل، اگر شیرازہ بندِ بیخودی رہیے
ہزار آشفتگی مجموعۂ یک خواب ہو جاوے
اسدؔ! باوصفِ عجز بے تکلف خاک گردیدن
غضب ہے گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

○

تاچند، نازِ مسجد و بتخانہ کھینچیے چوں شمع، دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے
ہے ذوقِ گریہ عزمِ سفر کیجیے اسدؔ!
رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

○

دامانِ دل بہ وہم تماشا نہ کھینچیے اے مدّعی! خجالتِ بیجا نہ کھینچیے
گل سربسر، اشارۂ جیبِ دریدہ ہے نازِ بہار، جز بہ تقاضا نہ کھینچیے
حیرت، حجابِ جلوہ و وحشت، غبارِ راہ پائے نظر بدامنِ صحرا نہ کھینچیے
واماندگی، بہانہ و دلبستگی، فریب دردِ طلب بہ آبلۂ پا نہ کھینچیے
خود نامہ بن کے جائیے، اُس آشنا کے پاس
کیا فائدہ کہ منّتِ بیگانہ کھینچیے

○

جامِ ہر ذرّہ، ہے سرشارِ تمنا مجھ سے کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے
جوشِ فریاد سے لونگا دیتِ خواب، اسدؔ! شوخیِ نغمۂ بیدلؔ نے جگایا ہے مجھے

* * *

دلِ آگاہ، تسکیں خیز بیدردی نہ ہو یارب!   نفس، آئینہ دار آہِ بے تاثیر بہتر ہے
خدایا! چشم تا دل درد ہے، افسونِ آگاہی   نگہ حیرت سوادِ خوابِ بے تعبیر بہتر ہے
درونِ جوہرِ آئینہ، جوں برگِ حنا، خوں ہے   بتاں! نقشِ خود آرائی، حیا تحریر بہتر ہے

* * *

دریوزۂ سامانہا، اے بے سر و سامانی!   ایجادِ گریبانہا، در پردۂ عُریانی
تمثالِ تماشاہا، اقبالِ تمنّا ہا   عجزِ عرقِ شرمے، اے آئینہ! حیرانی
دعوائے جنوں باطل، تسلیمِ عبث حاصل   پروازِ فنا مشکل، میں عجزِ تن آسانی
بیگانگیِ خُوہا، موجِ رمِ آ ہُوہا   دامِ گلۂ اُلفت، زنجیرِ پشیمانی
پرواز تپش رنگے، گلزار ہمہ تنگے   خوں ہو قفسِ دل میں، اے ذوقِ پَر افشانی!
سنگ آمد و سخت آمد، دردِ سرِ خوداری   معذورِ سبکساری، مجبورِ گرانجانی
گلزارِ تمنّا ہوں، گلچینِ تماشا ہوں
صد نالہ اسدؔ بلبل، در بندِ زباندانی

* * *

دو جہاں گردشِ یک سُبحۂ اسرارِ نیاز   نقد صد دل، بگریبانِ سَحَر پنہاں ہے
خلوتِ دل میں نہ کر دخل، بجز سجدۂ شوق   آستاں میں صفتِ آئینہ در پنہاں ہے

* * *

نظر پرستی و بیکاری و خود آرائی   رقیبِ آئینہ ہے حیرتِ تماشائی
خرابِ نالۂ بلبل، شہیدِ خندۂ گُل   ہنوز دعوئے تمکین و بیمِ رُسوائی
ہزار قافلۂ آرزو، بیاباں مرگ   ہنوز محملِ حسرت بہ دوشِ خودرائی
وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ، عجزِ وفا   اسدؔ! ہنوز گمانِ غرورِ دانائی

* * *

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے   کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے   چراغِ صبح و گُلِ موسمِ خزاں تجھ سے
بہارِ حیرتِ نظارہ، سخت جانی سے   حنائے پائے اجل، خونِ کشتگاں، تجھ سے
طراوتِ سحر ایجادیِ اثر، یکسُو   بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے
چمن چمن گل آئینہ درکنارِ ہوس   اُمید محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے
نیاز، پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے   جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے
بہانہ جوئی رحمت، کمیں گرِ تقریب   وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے
اسدؔ! بہ موسمِ گُل در طلسمِ کُنجِ قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

◆

چار سُوے عشق میں صاحب دکانی مُفت ہے
نقد ہے داغِ دل اور آتش زبانی مُفت ہے
چونکہ بالاے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے
بر ہو سہاے جہاں، دامن فشانی مُفت ہے

◆

اسدؔ! جاں نذرِ الطافے، کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مُو، حالِ دل پُرسیدنی جانے

◆

رکھ فکرِ سخن میں تو معذور مجھے، غالبؔ!
یاں زَورقِ خود داری طوفانیِ معنی ہے

Read or download More books go www.iqbalkalmati.blogspot.com

◆

خوبصورت اور معیاری کتاب چھپوانے کے لئے شعیب میمن سے رابطہ کیجئے۔
موبائل نمبر: 0300-9231954

خوبصورت اور معیاری کتابیں

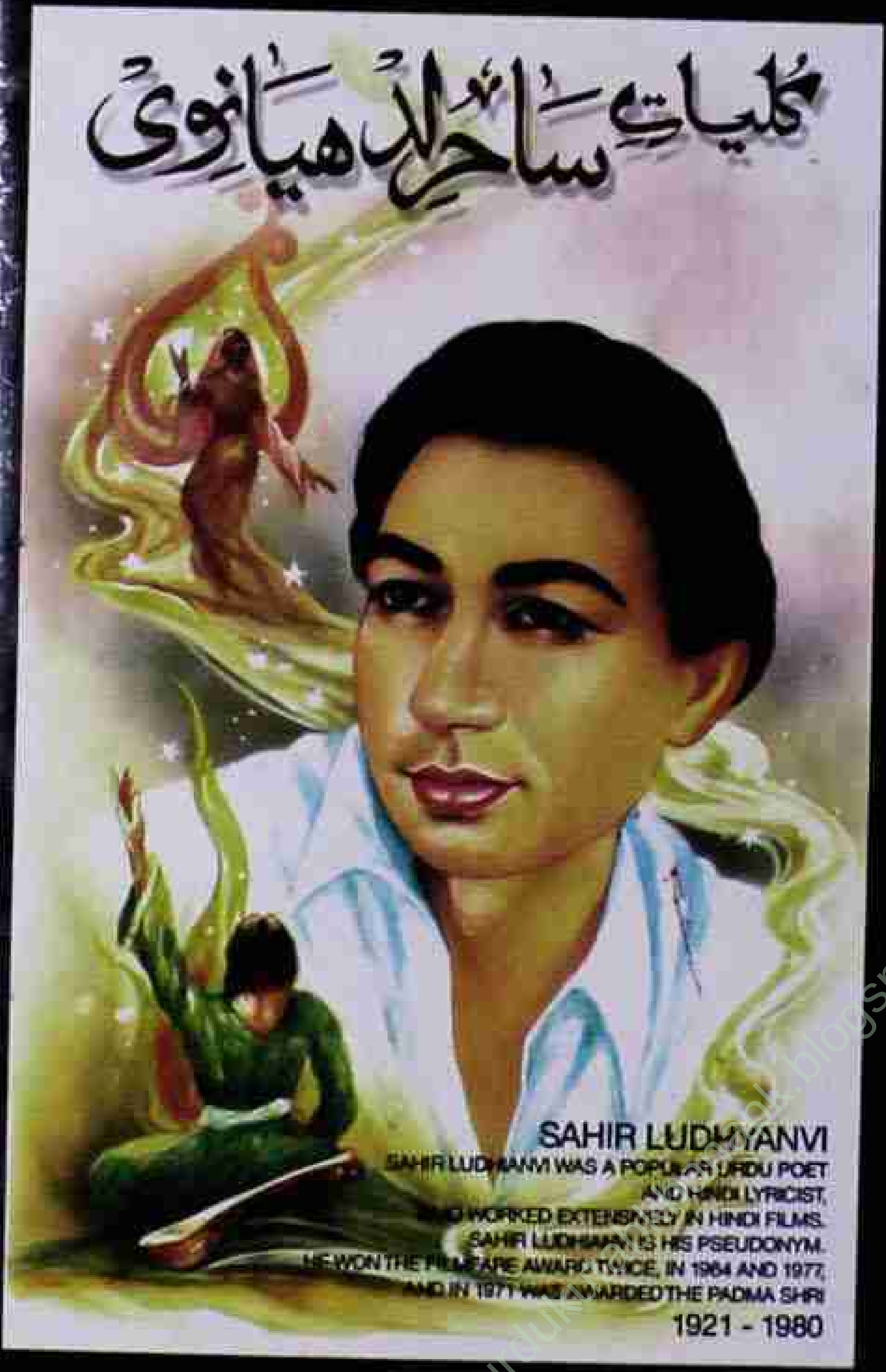
کلیاتِ ساحر لدھیانوی
SAHIR LUDHYANVI
SAHIR LUDHIANVI WAS A POPULAR URDU POET
AND HINDI LYRICIST,
AND WORKED EXTENSIVELY IN HINDI FILMS.
SAHIR LUDHIANVI IS HIS PSEUDONYM.
HE WON THE FILMFARE AWARD TWICE, IN 1964 AND 1977,
AND IN 1971 WAS AWARDED THE PADMA SHRI
1921 - 1980

کلیاتِ اقبال

ثناء پبلیکیشنز کراچی